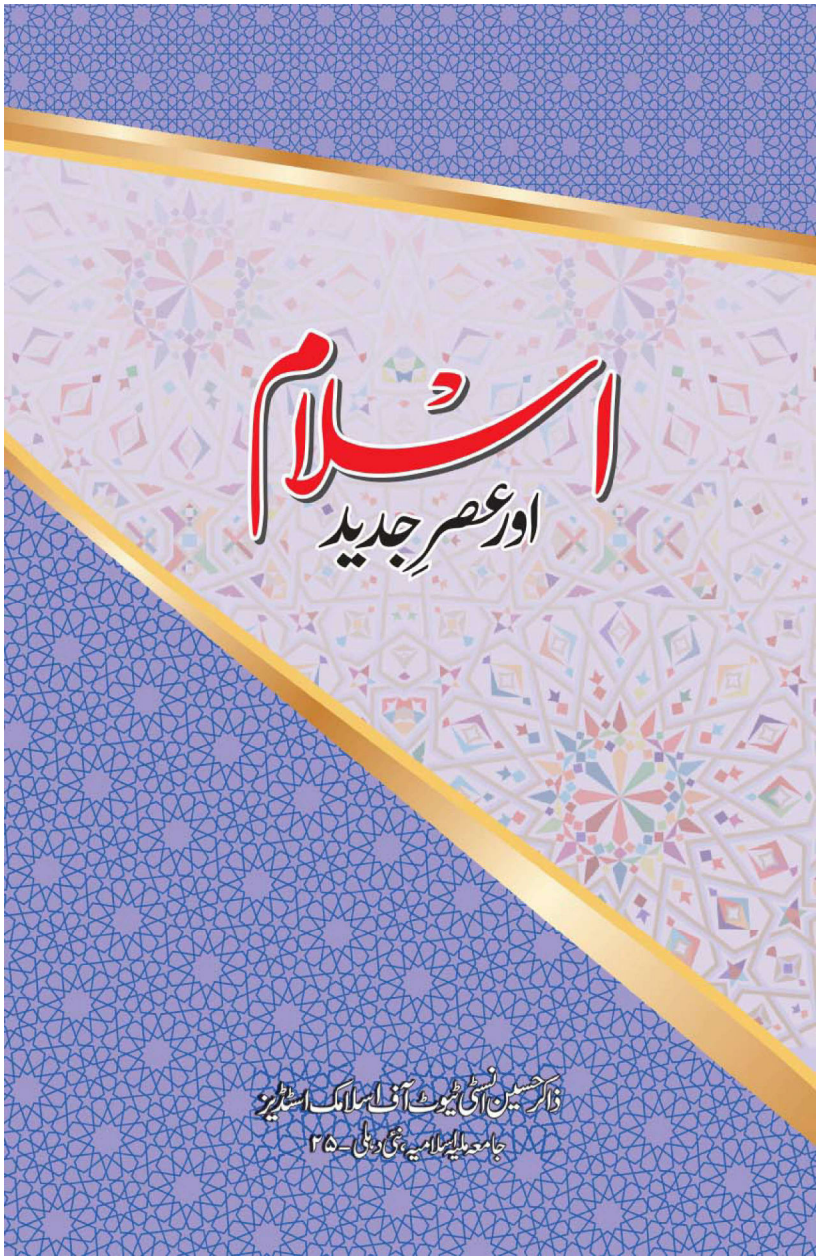
اسلام
اور عصرِ جدید
ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی-۲۵

اسلام اور عصرِ جدید

مدیر

اقتدار محمد خاں

نائب مدیر

محمد سعید انور

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۲۵

اسلام اور عصرِ جدید (سہ ماہی)

(جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر)

جلد نمبر: ۵۵ اپریل ۲۰۲۳ء شمارہ: ۲

ISSN 2278-2109

اعانت زر کی شرحیں

	فی شمارہ	سالانہ	
اندرون ملک	100/روپے	380/روپے	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
پاکستان و بنگلہ دیش	4/امریکی ڈالر	15/امریکی ڈالر	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
دیگر ممالک	12/امریکی ڈالر	40/امریکی ڈالر	(رجسٹرڈ ہوائی ڈاک سے)

حیاتی رکنیت

اندرون ملک	5000/روپے
پاکستان و بنگلہ دیش	150/امریکی ڈالر
دیگر ممالک	400/امریکی ڈالر

اس شمارے کی قیمت 100/روپے

پرنٹنگ اسسٹنٹ: راشد احمد **ٹائٹل:** ارتج گرافکس

© جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ
مقالہ نگاروں کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

پتہ

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

Website: www.jmi.ac.in/zhiis E-mail:zhis@jmi.ac.in

طابع وناشر: **پروفیسر اقتدار محمد خاں** اعزازی ڈائرکٹر، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۲۵

مطبوعہ : لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

بانی مدیر

ڈاکٹر سید عابد حسین (مرحوم)

مجلسِ ادارت

پروفیسر نجمہ اختر (صدر)

- پروفیسر طلعت احمد
- نجیب جنگ آئی۔اے۔ایس (ریٹائرڈ)
- سید شاہد مہدی آئی اے ایس (ریٹائرڈ)
- لیفٹیننٹ جنرل محمد احمد ذکی (ریٹائرڈ)
- پروفیسر اختر الواسع
- پروفیسر محمود الحق
- پروفیسر سلیمان صدیقی

فہرست

❐	حرف آغاز	اقتدار محمد خاں	۷
❐	ابوریحان البیرونی اور ہندوستان	نثار احمد فاروقی	۱۷
❐	شہرۂ آفاق محدثین کا فقہی رجحان اور مسلکی مزاج	محمد خالد حسین نیموی قاسمی	۲۷
❐	آبروئے شیراز سعدی شیرازی	مغیث احمد	۴۷
❐	ہندوستانی مذاہب پر مسلم علماء کا تحریری سرمایہ	ظفر دارک قاسمی	۱۱۳

حرف آغاز

ام المومنین سیدہ زینب بنت جحش کی ولادت اعلان نبوت سے تقریباً بیس سال پہلے ہوئی۔ آپ کا پیدائشی نام برہ تھا جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبدیل فرما کر زینب کر دیا۔ والد محترم کی طرف سے آپ کا سلسلہ نسب حسبِ ذیل ہے۔ زینب بنت جحش بن رئاب بن یعمر بن مرّہ بن مروہ بن کثیر بن غنم بن دودان بن سعد بن خزیمہ۔ والدہ کی طرف سے آپ کا سلسلہ نسب مندرجہ ذیل ہے۔ زینب بنت امیمہ بنت عبدالمطلب بن ہاشم...اس طرح حضرت زینب رشتے میں آپ کی پھوپھی زاد بہن ہوتی ہیں۔ سیدہ زینب کی والدہ محترمہ امیمہ عبدالمطلب کی دوسری بیوی فاطمہ بنت عمرو کی بیٹی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد عبداللہ، حضرت علی کے والد ابو طالب، زبیر بن عبدالمطلب اوران کے علاوہ عاتکہ، برہ، بیضاء اور اَرویٰ یہ سب

فاطمہ بنت عمرو کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ کی دو بھابھیاں ام حبیبہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہما (زوجہ عبداللہ بن جحش) اور زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا (زوجہ عبداللہ بن جحش) ازواج مطہرات میں شامل تھیں۔ آپ پہلے اسلام قبول کرنے والوں میں سے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے نکاح میں حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا پہلے سے موجود تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کا دوسرا نکاح حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے کرنا چاہا اور ان کے گھر پیغام بھیجا۔ پیغام ملنے کے بعد حضرت زینب رضی اللہ عنہا اور ان کے بھائی عبدالرحمٰن بن جحش نے خاندانی فوقیت کے پیشِ نظر اور اُس وقت کے حالات کے تناظر میں اسے ناپسند سا خیال فرمایا کہ قریش کی ایک آزاد معزز خاتون کا نکاح ایک آزاد کردہ غلام سے ہو۔ چونکہ اُس وقت کی معاشرتی روش یہی تھی کہ دو ایسے خاندان میں جن میں مالی و خاندانی برتری و کمتری پائی جاتی ہو نکاح کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اسلام نے دنیا میں مساوات کی جو تعلیم رائج کی ہے اور خاندانی برتری و کمتری کی تفریق کو جس طریقے سے ختم کیا ہے اس کی مثال کسی اور مذہب میں نہیں ملتی۔ اس کی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن یہ واقعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ان سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ قریش اور خصوصاً خاندان بنی ہاشم کو کعبہ کا متولی ہونے کی وجہ سے عرب میں جو مقام حاصل تھا اس کے لحاظ سے شاہان یمن بھی ان کی ہمسری کا دعوی نہیں کرسکتے تھے لیکن اسلام نے بزرگی کا معیار

محض تقوی کو قرار دیا اور فخر ومباہات کو جاہلیت کی علامت ٹھہرایا ہے۔اس اسلامی کسوٹی پر دیکھا جائے تو اگر چہ حضرت زید رضی اللہ عنہ بظاہر غلام تھے لیکن چونکہ وہ تقویٰ وللّٰہیت کے اعتبار سے ایک صالح مسلمان تھے اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف سے پیغام نکاح حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے گھر بھیجا۔تاہم حضرت زینت رضی اللہ عنہا اور آپ کے گھر والے معاشرتی طور پر اسے پسند نہیں فرما رہے تھے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوئی:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا.

ترجمہ: اور جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا حتمی فیصلہ فرما دیں تو نہ کسی مومن مرد کے لیے اور نہ ہی کسی مومنہ عورت کے لیے یہ گنجائش ہے کہ وہ اپنے اختیارات کو باقی رکھیں۔اور جس کسی نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔

سورۃ الاحزاب آیت: ۳۷ میں اللہ رب العزت فرماتا ہے:

اور تم اس شخص سے جس پر خدا نے احسان اور تم نے بھی احسان کیا (یہ) کہتے تھے کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رہنے دو اور خدا سے ڈرو۔اور تم اپنے دل میں وہ بات پوشیدہ رکھتے تھے جس کو خدا ظاہر کرنے والا تھا اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ خدا ہی اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ڈرو۔پھر جب زید نے اس سے (کوئی) حاجت (متعلق) نہیں رکھی (یعنی اس کو طلاق دے دی) تو ہم نے تم سے اس کا نکاح کر دیا تا کہ مومنوں کے لیے ان

کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں (کے ساتھ نکاح کرنے کے بارے) میں جب وہ ان سے اپنی حاجت نہ رکھیں (یعنی طلاق دے دیں) کچھ تنگی نہ رہے اور خدا کا حکم واقع ہو کر رہنے والا تھا۔ یہ خطاب براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔

حضرت زینب بنت جحش کا نکاح نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشورے سے حضرت زید بن حارثہ کے ساتھ ہو گیا، مگر دونوں کی طبیعتوں میں موافقت نہ ہوئی۔ حضرت زید حضرت زینب کی تیز زبانی اور نسبی شرافت کی بنا پر اپنے کو اونچا سمجھنے اور اطاعت میں کوتاہی کرنے کی شکایت کیا کرتے تھے۔ دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یہ بتلا دیا گیا تھا کہ زید ان کو طلاق دیں گے، اس کے بعد زینب آپ کے نکاح میں آئیں گی۔ ایک روز حضرت زید نے انہی شکایات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر کے اپنا یہ ارادہ ظاہر کیا کہ ان کو طلاق دے دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اگرچہ منجانب اللہ یہ علم ہو گیا تھا کہ واقعہ یوں ہی پیش آنے والا ہے کہ زید ان کو طلاق دے دیں گے، پھر یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نکاح میں آئیں گی، لیکن دو وجہوں سے آپ نے حضرت زید کو طلاق دینے سے روکا۔ اول یہ کہ طلاق دینا اگرچہ شریعت اسلام میں جائز ہے مگر پسندیدہ نہیں بلکہ **ابغض المباحات** یعنی جائز چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض و مکروہ ہے، اور تکوینی طور پر کسی کام کا وقوع تشریعی حکم کو متاثر نہیں کرتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ قلب مبارک میں یہ بھی خیال پیدا ہوا کہ اگر انہوں نے طلاق دے دی اور پھر زینب کا نکاح آپ سے ہوا تو عرب اپنے دستور جاہلیت کے مطابق یہ طعنے

دیں گے کہ اپنے بیٹے کی بیوی سے نکاح کرلیا۔ اگرچہ قرآن نے اس دستور جاہلیت کو سورہ احزاب کی ہی سابقہ آیات میں ختم کردیا ہے۔ اس کے بعد کسی مومن کے لیے تو اس کے وسوسہ کا بھی خطرہ نہ تھا مگر کفار جو قرآن ہی کو نہیں مانتے وہ اپنی جاہلانہ رسم یعنی منہ بولے بیٹے کو تمام احکام میں حقیقی بیٹے کی طرح سمجھنے پر زبان طعن دراز کریں گے۔ یہ اندیشہ بھی حضرت زید کو طلاق دینے سے منع کرنے کا سبب بنا۔ اس پر حق تعالیٰ کی طرف سے محبوبانہ عتاب قرآن کی ان آیات میں نازل ہوا: (آیت) **وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِیْ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَاهُ.** (سورہ احزاب، آیت: ۳۷)

یعنی آپ اس وقت کو یاد کریں جب کہ آپ کہہ رہے تھے اس شخص کو جس پر اللہ نے انعام کیا اور آپ نے بھی انعام کیا، مراد اس شخص سے حضرت زید ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے پہلا انعام تو یہ فرمایا کہ ان کو مشرف با اسلام کردیا دوسرے آپ کی صحبت کا شرف عطا فرمایا۔ اور آپ نے ان پر ایک انعام تو یہ کیا کہ ان کو غلامی سے آزاد کردیا، دوسرا یہ کہ ان کی تربیت فرما کر ایسا بنادیا کہ بڑے بڑے صحابہ بھی ان کی تعظیم کرتے تھے۔ آگے وہ قول نقل کیا جو آپ نے زید سے فرمایا (آیت) **أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّه**، یعنی اپنی بیوی کو آپ اپنے نکاح میں روکیں، طلاق نہ دیں اور خدا سے ڈریں۔ خدا سے ڈرنے کا حکم اس جگہ اس معنی میں بھی ہوسکتا ہے کہ طلاق ایک مبغوض ومکروہ فعل ہے اس سے اجتناب کریں اور اس معنی سے بھی ہوسکتا ہے

کہ نکاح میں روکنے کے بعد طبعی منافرت کی وجہ سے ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کریں۔ آپ کا یہ فرمانا اپنی جگہ صحیح و درست تھا، مگر منجانب اللہ ہونے والے واقعہ کا علم ہوجانے اور دل میں حضرت زینب سے نکاح کا ارادہ پیدا ہوجانے کے بعد زید کو طلاق نہ دینے کی نصیحت ایک طرح رسمی اظہار خیر خواہی کے درجہ میں تھی، جو شان رسالت کے مناسب نہ تھی، خصوصاً اس لیے کہ اس کے ساتھ لوگوں کے طعنوں کا اندیشہ بھی شامل تھا۔ اس لیے آیت مذکورہ میں عتاب ان الفاظ میں نازل ہوا کہ آپ دل میں وہ بات چھپا رہے تھے جس کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا تھا۔ جب منجانب اللہ حضرت زنیب کے ساتھ آپ کے نکاح کی خبر مل چکی، اور آپ کے دل میں ارادہ نکاح پیدا ہو چکا تو اس ارادہ کو چھپا کر ایسی رسمی گفتگو جو آپ کی شان کے مناسب نہیں تھی کی۔ اور لوگوں کے طعنوں کے اندیشہ پر فرمایا کہ آپ لوگوں سے ڈرنے لگے، حالانکہ ڈرنا تو آپ کو اللہ ہی سے سزاوار ہے۔ یعنی جب آپ کو یہ معلوم تھا کہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے والا ہے، اس کی ناراضگی کا اس میں کوئی خوف وخطر نہیں تو پھر محض لوگوں کے طعنوں سے گھبرا کر آپ کے لیے یہ گفتگو مناسب نہیں تھی۔ اس واقعہ کی جو تفصیل اوپر لکھی گئی ہے، یہ سب تفسیر ابن کثیر اور قرطبی اور روح المعانی سے لی گئی ہے، اور (آیت) **تخفی فی نفسک ما اللّٰہ مبدیہ** کی یہ تفسیر کہ وہ چیز جس کو آپ نے دل میں چھپایا تھا وہ یہ ارادہ تھا کہ زید نے طلاق دے دی تو حکم الٰہی کے مطابق آپ ان سے نکاح کرلیں گے، یہ تفسیر حکیم ترمذی اور ابن ابی حاتم وغیرہ محدثین نے حضرت علی بن حسین زین

العابدین کی روایت سے نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: ''یعنی اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بذریعہ وحی یہ اطلاع دے دی تھی کہ حضرت زینب کو زید طلاق دینے والے ہیں اور اس کے بعد وہ آپ کے نکاح میں آئیں گی''۔ اور ابن کثیر نے ابن ابی حاتم کے حوالے سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں: ''یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو پہلے ہی بتلا دیا تھا کہ حضرت زینب بھی ازواج مطہرات میں داخل ہوجائیں گی، پھر جب حضرت زید ان کی شکایت لے کر آپ کی خدمت میں آئے تو آپ نے فرمایا کہ اللہ سے ڈرو اور اپنی بیوی کو طلاق نہ دو، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے تو آپ کو بتلا دیا تھا کہ میں ان سے آپ کا نکاح کرادوں گا اور آپ اپنے دل میں اس چیز کو چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا تھا۔ (معارف القرآن)

۵ ہجری ذیقعدہ کا مہینہ تھا سیدہ زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عمر ۳۸ سال ہوچکی تھی، طلاق کے بعد ایام عدت پورے ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا کہ زید! آپ جاؤ اور زینب کو میری طرف سے پیغام نکاح دے دو۔ چنانچہ حضرت زید رضی اللہ عنہ فوراً حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے مکان کی طرف چل پڑے۔ ابھی پردہ کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے، خود فرماتے ہیں: جب میں سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے گھر پہنچا تو وہ میری نگاہ میں نہایت قابل عزت واحترام تھیں کہ میں ان کی طرف نظر نہ اٹھا سکا یہاں تک کہ ادب واحترام کی وجہ سے میں ان کی طرف پشت کر کے کھڑا ہوا اور کہا: ''آپ

کے لیے بہت بڑی خوشخبری ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے آپ کے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آپ کو نکاح کا پیغام دوں۔

سیدہ زینب رضی اللہ عنہا نے فرمایا: میں اس بات کا کوئی جواب نہیں دے سکتی یہاں تک کہ میں اپنے رب سے اس بارے میں مشورہ نہ کرلوں اور پھر اٹھ کر نماز استخارہ پڑھنا شروع کی۔ ادھر دوسری طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی اترنا شروع ہوگئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے: ''کون ہے جو زینب کو یہ خوشخبری سنائے کہ اللہ تعالیٰ نے میرا نکاح ان سے کردیا ہے'' اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ احزاب کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْ أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ أَمْرُ اللهِ مَفْعُوْلًا.

''جب زید نے اپنی بیوی سے تعلق ختم کرلیا تو ہم نے اس سے آپ کا نکاح کرا دیا تاکہ مسلمانوں کے لیے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کرنے میں اُس وقت کوئی تنگی نہ رہے جب انہوں نے اپنی بیویوں سے تعلق ختم کرلیا ہو اور اللہ نے جو حکم دیا ہے اس پر تو عمل ہو کر ہی رہنا تھا۔''

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا دیگر ازواج مطہرات پر بطور فخر فرماتیں کہ تمہارے نکاح تمہارے گھر والوں نے کرائے میرا نکاح اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں سے اوپر خود کرایا۔

حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سیدہ زینب اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہما دونوں اپنے اپنے طور پر فخر کیا کرتی تھیں، سیدہ زینب رضی اللہ عنہا فرماتیں: میں وہ ہوں جس کا نکاح آسمان پر ہوا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتیں: میں وہ ہوں جس کی عفت و آبرو کی گواہی آسمان سے آئی۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں آپ کو وہ تین باتیں بتاتی ہوں جو میرے علاوہ آپ کی کسی بیوی کو حاصل نہیں۔

- میرا اور آپ کا دادا ایک ہے۔ یعنی عبدالمطلب
- میرا آپ کے ساتھ نکاح اللہ تعالیٰ نے آسمانوں پر کرایا ہے۔
- اور ہمارے اس خدائی نکاح کی خوشخبری دینے والا جبرائیل امین ہے۔

سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے اوصاف و کمالات کا تذکرہ آپ کی سوکنیں امہات المومنین نے بھی فرمایا ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر کوئی عورت زیادہ دین دار، پرہیزگار، زیادہ راست گفتار، زیادہ جود وسخا کی مالک، اللہ کے راہ میں خرچ کرنے اور رضائے الٰہی کو حاصل کرنے کے لیے آپ رضی اللہ عنہا سے زیادہ سرگرم نہیں دیکھی۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے وصال کی خبر سن کر مدینہ منورہ کے غریبوں، فقیروں اور مسکینوں میں غم کی لہر دوڑ گئی اور وہ گھبرا گئے کہ ان کے بعد اس قدر ہمارا پرسان حال اور کون ہوگا؟ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ

عنہا ایک خوب صورت خاتون تھیں، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے آپ رضی اللہ عنہا کے پاس جایا کرتے تھے۔ صالح، روزہ دار اور شب بیدار تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اپنی ازواج مطہرات سے فرمایا: تم میں سے وہ مجھے جلد ملے گی جس کا ہاتھ لمبا ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات سن کر امہات المومنین رضی اللہ عنہ اپنے اپنے ہاتھ ناپنے لگیں۔ اس میں لمبا ہاتھ سیدہ سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا کا تھا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد امہات المومنین میں سے سب سے پہلے سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا تو امہات المومنین سمجھ گئیں کہ لمبے ہاتھ سے مراد سخاوت اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔ کیونکہ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا سخاوت و دریا دلی میں سب سے آگے تھیں۔ آپ رضی اللہ عنہا کی وفات ۲۰ ہجری کو ہوئی، آپ کی کل عمر ۵۳ سال کے قریب تھی۔

اقتدار محمد خان

نثار احمد فاروقی *

ابوریحان البیرونی اور ہندوستان

ہندوستان ہر عہد میں سیاحوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اس کی دولت وثروت کے علاوہ سرسبز وشاداب علاقے، حسین اور نظر نواز قدرتی مناظر، عظیم الشان تاریخی آثار اور عمارتیں غیر ملکیوں کے دامنِ دل کو ہمیشہ کھینچتی رہی ہیں۔ قدرت نے بھی ہندوستان کو اپنی گوناگوں نعمتوں سے نوازا ہے اور یہی نعمتیں کبھی کبھی اس کے حق میں زحمت بھی بن گئی ہیں۔ بدیسی حملہ آوروں نے اِن خزانوں کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا ہے اور اس مادّی دولت کی خاطر یہاں کے سماجی نظام اور معاشرتی سکون کو بار بار درہم برہم کیا ہے۔ تاریخ میں اِن فرماں رواؤں کی کشور کشائی اور جہانگیری کی کہانیاں تو بڑی فراخ حوصلگی سے درج ہوئی ہیں مگر ہندوستان کی سرزمین سے علم کی دولت حاصل کرنے کے لیے آنے والے علم دوست سیاحوں کا حال مورّخوں نے بھی فراموش کر دیا ہے۔ طلبِ علم کی خاطر زمیں نوردی کرنے والے یہ سیاح امن وآشتی کا پیغام لاتے تھے اور فلسفہ وحکمت کے بیش بہا موتی یہاں سے اپنے دامن میں سمیٹ کر لے جاتے تھے۔ اُن کی چھوڑی ہوئی کتابیں آج بھی ہند کے عہد قدیم کے مورخوں کا اولین سرمایہ اور اصلی ماخذ ہیں۔ مگر ان کی علمی فتوحات سے ہم عام طور سے بے خبر ہیں۔

* سابق پروفیسر وہیڈ ڈپارٹمنٹ آف عربک، دہلی یونیورسٹی

ہندوستان میں سیاحوں کی آمد کا سلسلہ ہزاروں سال سے جاری ہے۔ میگاتھینز فاہیان، یوان چونگ وغیرہ یونانی اور چینی سیاحوں نے جو یادداشتیں ہمارے لیے چھوڑی ہیں اُن کی قدر و قیمت اُن سب خزانوں سے زیادہ ہے جو غیر ملکی حملہ آور یہاں سے لوٹ کر لے گئے تھے۔ اس لیے کہ وہ خزانے تو خرچ ہو گئے مگر اِن سیّاحوں کے بیانات اُس عہد کی تاریخ کے سب سے معتبر اور قیمتی ماخذ کی حیثیت سے آج تک موجود ہیں۔ یہ اگر نہ ہوتے تو ہماری قدیم تاریخ کے بہت سے گوشے تاریکی میں رہ جاتے اور ان کے بارے میں ہم کسی طرح بھی کچھ نہ جان سکتے تھے۔

انھیں سیّاحوں میں ایک بڑا اور اہم نام ابوریحان محمد بن احمد البیرونی (متوفی ۴۴۰ھ/ ۱۰۴۸ء) کا ہے جس کے لیے فرانسیسی مستشرق ملینو (Mallino) کہتا ہے کہ ''وہ تمام علماء و حکمائے اسلام میں سب سے زیادہ ذہین، طبّاع اور علومِ طبیعی و ہندسہ میں سب سے بڑا محقق اور مدقق تھا۔'' اور ریمنڈ بیزلے (Ramond Beazley) کا خیال ہے کہ ''البیرونی اسلام کے ہر عہد اور ہر قوم میں سب سے بڑا نام ہے۔''

البیرونی ۳ر ذی الحجہ ۳۶۳ھ مطابق ۲۵ر اگست ۹۷۴ء کو خوارزم کے قریب ''بیرون'' نامی گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ جرجی زیدان نے بیرون کو سندھ کا ایک شہر بتایا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ خوارزم کا باشندہ تھا۔ ہمیں اس کے خاندانی حالات کا تفصیل سے علم نہیں۔ کوئی نہیں بتاتا کہ یہ ہونہار بچہ کس گھرانے کا چشم و چراغ تھا، کن گودوں میں پالا گیا، کن رفیقوں کے ساتھ کھیلا، کن استادوں نے اس کی تعلیم و تربیت کی۔ اس کے جتنے بھی حالات معلوم ہیں وہ خود اُس کی کتابوں میں مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے ہیں اور اُن سب کو جمع کرنے سے بھی کوئی واضح تصویر تیار نہیں ہوتی۔

جرجان میں وہ سلطان شمس العالی کے دامن و دولت سے وابستہ تھا جس نے اُسے اتنا نواز رکھا تھا کہ وہ فکرِ معاش سے فارغ رہ کر علم و حکمت کی تحصیل اور تحقیق میں خود کو مصروف رکھ سکے۔ البیرونی اپنے اس محسن کو یاد کرتا ہے تو احسان مندی کے جذبات صاف ظاہر ہوتے ہیں۔ پھر وہ خوارزم کے فرماں روا مامون کے دربار میں آ گیا لیکن زمانے کی گردش نے یہاں چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ سلطان محمود غزنوی اُس وقت غزنین میں حکومت کر رہا تھا اور اس نے چاروں طرف یلغار کر کے امن و سکون کو برباد کر رکھا تھا۔ اس نے خوارزم پر بھی حملہ کر کے وہاں کی بساط اُلٹ دی اور مامون کے سارے خاندان کو قید

کر کے دور دراز قلعوں میں بھیج دیا اور سارے مصاحبین کو جنگی قیدی بنا کر اپنے ساتھ غزنین لے آیا۔ ان اسیروں میں فلسفہ وحکمت، ریاضی و ہندسہ اور نجوم و ہیئت کا فاضل بے بدل ابوریحان البیرونی بھی تھا۔ اسے علمِ نجوم میں اعلیٰ درجے کی مہارت حاصل تھی جس کے قصے عروضی سمرقندی کی کتاب ''چہار مقالہ'' کے باب سوم میں بھی موجود ہیں اور بعد کے مورخین نے بھی لکھے ہیں۔ فرشتہ اپنی تاریخ میں ایسی روایات کو بطورِ خاص درج کرتا ہے۔

عروضی سمرقندی نے لکھا ہے کہ ایک دن سلطان محمود غزنوی ایک ایسے محل میں بیٹھا تھا جس کے چار دروازے تھے۔ اُس نے البیرونی کا امتحان لینے کی نیت سے کہا کہ وہ از روئے علمِ نجوم حساب لگا کر بتائے کہ سلطان کس دروازے سے باہر نکلے گا۔ البیرونی نے اپنا جواب ایک پرچے پر لکھ کر رکھ دیا اور سلطان سے عرض کیا کہ اب آپ باہر تشریف لے جائیں۔ اُس نے حکم دیا کہ مزدوروں کو بلایا جائے اور اسی وقت مشرقی دیوار میں ایک نیا دروازہ بنوایا اور اُس سے برآمد ہوا۔ اب البیرونی کا لکھا ہوا جواب دیکھا گیا تو اس نے یہی تحریر کر رکھا تھا کہ سلطان مشرقی دیوار میں نیا دروازہ بنوا کر اُس سے برآمد ہوگا۔ اب بادشاہ نے حکم دیا کہ البیرونی کو محل کی دیوار سے نیچے دھکیل دیا جائے لیکن جب البیرونی کو نیچے پھینکا گیا تو وہاں ایک جال بندھا ہوا تھا اس میں الجھ کر وہ آہستہ سے زمین پر گرا اور مطلق چوٹ نہیں لگی۔ سلطان نے پوچھا کیا تمھیں اس حادثے کا بھی پہلے سے علم تھا۔ البیرونی نے اپنے شاگرد کو بلایا اور اس سے کہا آج کا روزنامچہ دکھا۔ اسے کھولا گیا تو یہی لکھا تھا کہ آج سلطان مجھے بلندی سے نیچے پھینکے گا مگر مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

یہ کہانی اور بھی طویل ہے اور متعدد کتابوں میں بیان ہوئی ہے ممکن ہے بعد کے مورخوں نے رنگ آمیزی کر کے اسے کچھ کا کچھ کر دیا ہو۔ اس میں مبالغے کا عنصر بھی ہوسکتا ہے، مگر اتنا یقین ہے کہ البیرونی کو نجوم وفلکیات میں کامل دست گاہ حاصل تھی۔ سلطان محمود غزنوی سے البیرونی خوش نہیں ہے اور اُس کا تذکرہ بہت سرد الفاظ میں کرتا ہے۔ اس کے متواتر حملوں نے اجتماعی امن وسکون کو جس طرح غارت کیا تھا اُس کی شکایت بھی دبے لفظوں میں کر جاتا ہے۔ سلطان کے حملوں سے سندھ اور پنجاب ہی کو نہیں، شمالی ہند کے اکثر علاقوں کو زیروزبر کر دیا تھا۔ یہاں سے وہ فلسفہ وحکمت اور ریاضی ومنطق کے علماء ہی کو نہیں بلکہ ہندوستانی علوم کے فاضل پنڈتوں کو بھی جنگی قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ بلخ،

بخارا اور غزنین کے اطراف میں بودھ مت کئی صدیوں سے اپنے قدم جمائے ہوئے تھا، اس لیے یہ بھی ممکن ہے کہ خراسان کے شہروں بالخصوص غزنین میں آباد ہندو اور بودھ عالموں سے البیرونی کی ملاقاتیں رہی ہوں اور اُن سے کسب واستفادے کے مواقع ابتداء ہی میں نصیب ہو گئے ہوں۔ بہرحال ہمارے تذکرہ نگار بتاتے ہیں کہ البیرونی نے ۴۵ سال کی عمر میں ہندوستانی علوم سیکھنے کا عزم کیا۔ وہ تمام عالم اسلام میں پہلا فاضل ہے جس نے گہری ہمدردی کے ساتھ ہندومت اور ہندوستانی علوم کا مطالعہ کیا، سنسکرت اور پراکرت زبانوں سے واقفیت حاصل کی اور ہندومت کی بنیادی کتابوں کا براہِ راست مطالعہ کر کے ہندوستان سے متعلق اتنی کتابیں لکھیں کہ آج تک کسی غیر ہندوستانی فاضل نے ہندوستان کے بارے میں اتنا مواد اپنی تصانیف میں نہیں چھوڑا۔ ہمیں ہندوستان سے متعلق موضوعات پر البیرونی کی اٹھارہ کتابوں کے نام معلوم ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب ہندوستانی جوتش پر تھی۔ دوسری میں سنسکرت کی ایک کتاب کا ترجمہ اور اُس پر مجتہدانہ تبصرہ تھا۔ تیسری کتاب ہندی فلکیات سے متعلق تھی۔ چھے کتابیں ہندوستانی ریاضی، حساب، ہیئت اور ہندسہ کے موضوعات پر تھیں اِن میں برہم سدھانت (Brhama Sidhahanta) کا عربی ترجمہ بھی شامل ہے۔ دسویں کتاب جنتری کے حساب پر تھی جسے موجودہ اصطلاح میں کرونولوجی (Chronology) کہا جاتا ہے۔ تیرہویں کتاب میں وہ قواعد بیان ہوئے تھے جن سے اہلِ ہند عُمروں کا حساب لگاتے ہیں۔ چودھویں تالیف دراہامَہر کی سنسکرت تصنیف کا ترجمہ تھی۔ پندرہویں ایک کہانی ''دیش دتی و پربھاکر'' اور سولھویں آیورویدک پر تھی جس میں اُن کے ماضی کا حال لکھا گیا تھا جو عفونت سے پیدا ہوتے ہیں۔ سترہویں کتاب آواگون کے موضوع پر اور اٹھارہویں پاتنجلی کا عربی ترجمہ تھی۔

ان کے علاوہ بھی ہمیں متعدد ایسی کتابوں کے نام معلوم ہوتے ہیں جو البیرونی نے سنسکرت زبان سے عربی میں ترجمہ کی تھیں۔ لیکن افسوس ہے کہ زمانے کے بے درد ہاتھوں نے یہ سب خزانے برباد کر دیے اور آج ان میں سے کسی کا بھی سراغ نہیں ملتا۔

ہندوستانی علوم اور سائنس کے موضوعات پر ہمیں البیرونی کی صرف ایک ہی کتاب ملتی ہے جسے انیسویں صدی میں مستشرقین نے تلاش کر کے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کا متن عربی میں ہے اور ایڈورڈ سی زخاؤ (Edward C. Sachau) نے اسے ایڈٹ کر کے ۱۸۸۷ء میں شائع ہوا تھا، پھر اکا

ترجمہ جرمن زبان میں ہوا۔ ۱۹۱۰ء میں انگریزی ترجمہ بھی تفصیلی حواشی کے ساتھ دو جلدوں میں چھاپا گیا جس کا نام 'البیرونی کا ہندوستان' (Alberuni's India) ہے۔ اردو میں بھی اس کا ترجمہ 'کتاب الہند' کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوا ہے۔

قرونِ وسطیٰ میں کسی غیر ہندوستانی نے 'کتاب الہند' سے زیادہ جامع اور محققانہ اور مستند کتاب ہندوستان کے بارے میں نہیں لکھی۔ البیرونی کا ذہن تعصب سے پاک ہے، وہ ہندوستان کے بارے میں جو کچھ لکھتا ہے قدیم سنسکرت متنوں کے حوالے سے لکھتا ہے اور جہاں اہلِ ہند پر تنقید کرتا ہے یا ان کی بعض رسموں کے بُرے پہلو زیرِ بحث لاتا ہے وہاں بھی اُس کا مقصد توہین یا تضحیک نہیں ہوتا۔ ایسے موقعوں پر وہ اپنے قاری کے سامنے زمانۂ جاہلیت کے عربوں کی مثال پیش کرتا ہے کہ ایسا عربوں میں ہوتا رہا ہے۔ اِس لیے ان رسموں کی وجہ سے تم ہندوستانیوں کو حقیر نہ سمجھ لینا۔

وہ شاید پہلا مسلمان ہے جس نے عالمِ اسلام سے مقدس گیتا کا تعارف کرایا اور اس کے طویل اقتباسات اپنی کتاب میں درج کیے ہیں۔ وہ اہلِ ہند کے مذہبی عقائد سے بحث کرتے ہوئے جابجا یونانی فلسفیوں کے اقوال اور صوفیا کے خیالات سے اُن کا موازنہ بھی کرتا ہے۔ اس طرح تقابلی مذہب (Comparative Religion) کے میدان میں بھی اُس نے سب سے پہلے قدم بڑھایا ہے۔

کتاب الہند میں اسّی ابواب ہیں۔ ہر باب ایک نئے شعبۂ علم سے مخصوص ہے۔ اس طرح یہ کتاب ہندوستان پر ایک چھوٹی سی انسائیکلوپیڈیا بن گئی ہے جس میں ہندوؤں کا بنیادی عقیدہ، ان کا مذہبی فلسفہ، رُوح اور مادّے پر اہلِ ہند کی تحقیق، عقیدۂ تناسخ، جنت و دوزخ کے مدارج، نروان، تقسیم طبقات، ذات پات، ہندوؤں کا سماجی قانون اور ان کی شریعت، بُت پرستی کی حقیقت، وید اور پُران، سنسکرت گرامر، ہندو جیوتش، فلکیات اور ریاضی، مساحت اور ہندسہ، ہندوستانی شہر، پہاڑ، دریا وغیرہ سیکڑوں موضوعات زیرِ بحث آتے ہیں۔

البیرونی کہتا ہے کہ ''ناصر الدولہ سبکتگین نے اپنے جانشینوں کے لیے ایسے راستے بنا دیے جن پر اُس کے فرزند یمین الدولہ محمود نے گامزن ہو کر ہندوستان پر تیس سال تک حملے کیے۔ محمود نے اس ملک کی خوشحالی کو بالکل تباہ کر دیا اور اسے ایک داستانِ پارینہ بنا دیا، یہی سبب ہے کہ ہندوستانی علوم کے مرکز

حملہ آوروں کے راستے سے ہٹ کر اُن علاقوں میں منتقل ہو گئے جہاں ان کی رسائی دشوار تھی جیسے بنارس، کشمیر وغیرہ۔ ہندو علوم کے حاصل کرنے میں جو دشواریاں تھیں جن کی وجہ سے ہندوستان والے صدیوں تک اقوام عالم سے گھل مل نہ سکے ان کا بیان کرتے ہوئے البیرونی کہتا ہے:

''ہندو سمجھتے ہیں کہ اُن کے ملک جیسا اور کوئی ملک نہیں ہے۔ نہ اُن جیسی کوئی اور قوم ہے، نہ اُن کے بادشاہ جیسا کوئی بادشاہ ہے، نہ مذہب اور سائنس میں کوئی اُن کا ہمسر ہے۔ وہ طبعاً بہت خود پسند اور مغرور ہیں اور اپنے علوم دوسروں کو سکھانے میں بخل کرتے ہیں، اپنی ذات کے سوا کسی دوسری جاتی والے کو بھی نہیں سکھاتے۔ کسی غیر ملکی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اُن کی خود پسندی کا یہ عالم ہے کہ اگر تم ان سے کہو کہ فارسی یا خراسان میں بھی کوئی عالم موجود ہے تو وہ تمھیں جھوٹا سمجھیں گے۔ اگر وہ باہر کی دنیا میں سفر کریں اور دوسرے ملکوں کے علماء سے تبادلۂ خیالات کریں تو اُن کی یہ تنگ نظری دور ہو سکتی ہے۔ ویسے اُن کے آباء واجداد اتنے تنگ نظر نہیں تھے، جتنی موجودہ نسل ہے۔ دراہامہر برہمنوں کے واجب العزت ہونے کا بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یونانی اگر چہ ملیچھ ہیں لیکن عزت کے قابل ہیں اس لیے کہ وہ علوم میں دوسروں پر سبقت لے گئے ہیں مگر برہمنوں کا تو کہنا ہی کیا جو علم کی بلندی کے ساتھ ہی ذات کی تقدیس کے بھی قائل ہیں۔''

شریمد بھگوت گیتا سے البیرونی نے طویل اقتباسات کا عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ البیرونی کہتا ہے:

''ہندو موحّد ہیں۔ وہ ایک خدا کو مانتے ہیں۔ بُت پرستی کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ عام لوگوں کا ذہن مظاہر کائنات کی طرف راغب ہوتا ہے اور محسوس اشیاء سے جلد متاثر ہوتا ہے۔ مجرد تصورات صرف علماء کے ذہن میں یقین پیدا کر سکتے ہیں اس لیے بُت پرستی زیادہ تر کم علم عوام میں ہے اور ہندو علماء خدا کی وحدانیت پر اسی طرح عقیدہ رکھتے ہیں جیسے دوسری توحید

پرست قومیں رکھتی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ایک مثال سے یہ بات واضح ہوجائے گی۔تم پیغمبر کی تصویر بناؤ یا مکہ اور مدینے کا نقشہ کاغذ پر کھینچو اور اسے کسی غیر تعلیم یافتہ شخص کو دکھاؤ فوراً اس کے دل میں عقیدت اور محبت کے جذبات پیدا ہوں گے اور وہ اُس تصویر کو بوسہ دے گا یا آنکھوں سے لگائے گا اور ایسا محسوس کرے گا جیسے وہ ان مقاماتِ مقدسہ پر موجود ہے۔ اسی سبب سے بُت پرستی کو رواج ہوا ہے۔جن لوگوں کو علم حاصل ہے اور جو ''سار'' (کنبہ) تک پہنچ گئے ہیں وہ خدا کی ذات کا عرفان رکھتے ہیں اور اس کے سوا کسی مظہر کی پوجا نہیں کرتے۔''

البیرونی نے اپنی کتاب الہند اسی سال ختم کی ہے جس سال محمود غزنوی کی وفات ہوئی (۱۰۳۱ء) اس کے بعد وہ محمود کے جانشین سلطان مسعود کے دربار سے وابستہ رہا اور 'قانونِ مسعودی' جیسی کتاب لکھ کر اُس کے نام سے منسوب کی۔محمود غزنوی کے مقابلے میں وہ اُس کا مدّاح ہے اور مسعود کی علم دوستی اور فیاضی کی تعریف کرتا ہے۔

البیرونی نے اپنے عہد کے عالمِ اسلام کی خوب سیاحت بھی کی اور اپنے معاصر علم میں بوعلی سینا، ابن مسکویہہ، ابوسہیل مسیحی جیسے دانش وروں کی صحبت اٹھائی۔ ہندوستان میں وہ پنجاب، سندھ، کشمیر اور شمالی ہندوستان کے میدان (دوآبے) تک آیا۔ممکن ہے کہ اس نے دھارا اور قنوج کی سیاحت بھی کی ہو، لیکن بظاہر اس کا زیادہ وقت ملتان اور پشاور میں گزرا۔ چونکہ وہ علم حاصل کرنے کی سچی لگن رکھتا تھا اِس لیے جہاں بھی گیا وہاں کے عالموں کی تلاش کر کے اُن سے استفادہ کیا اور علمی بحث مباحثے بھی کیے۔ ان کے خیالات ونظریات معلوم کیے، نادر کتابوں کی کھوج کی اور مشکل مسئلوں کے حل ڈھونڈے، جس ملک سے دنیوی حکمراں ہیرے جواہرات سمیٹ کر لے جاتے تھے وہاں سے وہ علم حکمت کے بیش بہا موتی اپنے دامن میں بھر کر لے گیا اور پھر انھیں ہمارے لیے ہی محفوظ کر دیا۔اس کی تصانیف میں سنسکرت کی ایسی متعدد کتابوں کے حوالے یا اقتباسات مل جاتے ہیں جو اب قطعاً نایاب ہو چکی ہیں۔

۱۰۳۱ء میں البیرونی غزنین میں موجود تھا اور اُس وقت تک ہندوستان سے متعلق دو درجن کتابیں جن میں سنسکرت کتابوں کے تراجم بھی شامل ہیں اُس کے قلم سے نکل چکی تھیں۔اس سے یہ نتیجہ

نکالا جاسکتا ہے کہ البیرونی نے سلطان محمود غزنوی کے درد میں ہندوستان کی سیاحت کی تھی۔ جب محمود غزنوی اپنا لاؤلشکر لے کر زمین فتح کرتا پھر رہا تھا۔ یہ علم وحکمت کی اقلیم کا تاجدار اپنا علمی خزانہ جمع کر رہا تھا۔ آج محمود غزنوی کی شخصیت نزاعی ہے مگر البیرونی کے بارے میں سب کو اتفاق ہے کہ وہ اپنے عہد کا سب سے بڑا دماغ تھا اور اس نے اہلِ ہند پر بڑے احسانات کیے ہیں۔ عالم اسلام میں ہندو مذہب کا اُس سے بڑا کوئی فاضل آج تک نہیں گزرا (جس نے ایسی تندہی اور دلچسپی سے علومِ ہند کا مطالعہ کیا ہو۔

ایک ہم عصر مورّخ البیہقی لکھتا ہے کہ ''قانونِ مسعودی'' جسے البیرونی نے شہاب الدولہ مسعود کے عہد میں تالیف کیا تھا اُس کی سب تصانیف میں پیشانی کے نور کی طرح درخشاں اور دوسرا معاصر شہرزوری کہتا ہے کہ میں نے یہ روایت سنی ہے کہ جب اُس نے ''قانون مسعودی'' تصنیف کی تو سلطان مسعود نے ایک ہاتھی بھر چاندی (کے سکّے) انعام میں دیے۔ مگر البیرونی نے انھیں خزانے میں واپس کر دیا۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ علم وحکمت میں اُس کی جانفشانی اور دیدہ ریزی دنیوی مال ومنال کے لالچ میں نہیں تھی۔ اُس نے جس دن سے ہوش سنبھالا، اس کے پائے طلب کی گردش نے ایک جگہ بیٹھنے نہیں دیا۔ علم میں سخت مجاہدات کرنے سے اُس کی صحت بھی متاثر ہوئی مگر اُسے آخر تک ایک ہی دُھن رہی کہ وہ علم کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کر سکے۔ ایک دوست کو اس نے خط میں لکھا تھا کہ

> ''اب میری عمر قمری حساب سے ۶۵ اور شمسی حساب سے ۶۳ برس ہوچکی ہے۔ میں ۶۱ سال کا ہوا تو میں نے خواب دیکھا تھا کہ میں چاند کے نکلنے اور ڈوبنے کی جگہ تلاش کر رہا ہوں لیکن وہ مجھے نظر نہیں آتے۔ اسی حالت میں کسی کہنے والے نے کہا کہ 'تو ایک سو نو مرتبہ چاند کا بیٹا ہے، مگر اس سے مجھے خوشی نہیں ہوئی۔ اس لیے عمر بسر ہوچکی ہے اور اب میں صرف اپنی نامکمل کتابوں کے مسودے مکمل کرنا چاہتا ہوں جن میں کچھ کتابیں سنسکرت کی بھی ہیں۔''

البیرونی نے ۷۷ سال ۷ ماہ کی عمر پا کر ۱۱ ستمبر ۱۰۴۸ء کو جمعہ کی شب میں انتقال ہوگیا۔ وہ غزنین میں فوت ہوا اور وہیں دفن کیا گیا، لیکن آج اُس کی قبر کا نشان بھی نہیں ملتا۔

وہ ساری عمر مجرد رہا۔ اُس کی معنوی اولاد یہی کتابیں ہیں جو فلسفہ، منطق، طب، ریاضی،

ہندسہ، ہیئت، فلکیات، نجوم، مساحت، جغرافیہ، تاریخ، مذہب، علومِ طبیعی، کیمیا وغیرہ موضوعات پر گراں قدر معلومات سے بھرپور ہیں۔ تصنیف وتالیف میں وہ اتنا منہمک رہتا تھا کہ ایک معاصر شہرزوری لکھتا ہے کہ

> ''بجز نوروز اور مہرجان کے دو دن کے سال بھر میں کسی وقت البیرونی کا ہاتھ قلم سے، آنکھیں مطالعے سے اور دل ودماغ غور وفکر سے جدا نہ ہوتے تھے۔''

البیرونی پہلی بار ۴۵ سال کی عمر میں غزنین پہنچا تھا اور کتاب الہند کے اختتام کے وقت اُس کی عمر ساٹھ سال کی تھی۔ اور یہی وہ درمیانی مدت ہے جس میں اُس نے جان توڑ کوشش کر کے سنسکرت زبان سیکھی۔ ہندوستانی مذہب، فلسفہ، نجوم اور ریاضی کے اوق مسائل پر ایسی مہارت اور قدرت حاصل کر لی کہ ہندی علماء اور پنڈت بھی اس کے علم وفضل کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ

> ہندو ہیئت دانوں سے میرا تعلق اجنبی ہونے کی وجہ سے ابتدءاً شاگردانہ رہا لیکن تھوڑے ہی زمانے میں جب کچھ واقفیت ہوگئی تو میری حیثیت استاد کی ہوگئی۔ چونکہ مجھے ہیئت اور ریاضی میں پوری مہارت تھی، میں خود انھیں درس دینے لگا۔ پنڈتوں کو میری معلومات سے بڑا تعجب ہوا اور وہ حیران ہوکر پوچھتے تھے کہ تم نے یہ علم کس ہندو پنڈت سے حاصل کیا ہے؟ انھیں کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ کوئی اجنبی ان کے ملک میں آکر ہمسری کا دعویٰ کرسکتا ہے۔ وہ لوگ مجھے جادوگر سمجھتے تھے اور ودیاساگر کہہ کر پکارتے تھے۔

البیرونی کی رائے میں ہندو اعلیٰ پایے کے فلسفی، نہایت عمدہ ریاضی داں اور ماہر ہیئت تھے۔ اسے ہندوستانی فلسفہ سے خاص دلچسپی ہے اور اس موضوع پر البیرونی کی معلومات بھی بہت وسیع ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ قدیم حکمائے یونان وہند جنھیں وہ طبقۂ عوام سے جدا سمجھتا ہے، پکے توحید پرست تھے۔ اُس نے کہیں اس بات کی کوشش نہیں کی کہ مذہبِ اسلام کو ہندومت سے برتر ثابت کرے۔ ایسی بات اُس کے انداز تحقیق کے خلاف ہے۔ وہ علمی مباحث میں مذہبی مناظر کا دروازہ کھولنے کا روادار نہیں

ہوسکتا۔ البتہ اُس نے ہندوستانیوں کے بعض خیالات وعقائد سے اختلاف کیا ہے اور ان پر منصفانہ علمی انداز میں تنقید وتبصرہ بھی کرتا ہے۔ عام طور پر وہ ہندوؤں کی عقل ودانش کا مداح ہے اور جہاں ممکن ہوتا ہے اپنے اور ان کے خیالات کا تقابلی مطالعہ وموازنہ بھی کرتا ہے۔ اہلِ ہند کی دستکاری اور فنِ تعمیر کو اُس نے سراہا ہے۔ ایک موقع پر ہندوستان کے تالابوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اِس فن میں ہندوؤں کو کمال چابک دستی حاصل ہے۔ مسلمان جب ان تالابوں کو دیکھتے ہیں تو دنگ رہ جاتے ہیں ویسے تالاب بنانا تو درکنار یہ ان کے وصف کا حق بھی ادا نہیں کرسکتے۔

بھگوت گیتا سے اُس کے تاثر کا حال پہلے لکھا گیا، اس کے علاوہ بھی وہ منو کی دھرم شاستر، رامائن، مہابھارت، وید اور پُران کے اقتباسات بہ کثرت درج کرتا ہے اور اُن کی تعریف کرتا ہے۔ اڈورڈ زخاؤ نے 'کتاب الہند' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اگر مسلمان بجا طور پر اس کتاب پر فخر کرسکتے ہیں کہ یہ عربی ادب کے آسمان کا سب سے زیادہ درخشاں ستارہ ہے تو ہندوؤں کو بھی حق ہے کہ وہ اسے اپنی خوش نصیبی سمجھیں کہ ایک حق پرست علامۂ عصر نے ان کے آباء واجداد کے تمدن کی جیسی تصویر اپنے زمانے میں پائی تھی بے کم وکاست کھینچ دی ہے۔ بہت سے جزوی امور میں شاید انھیں اختلاف ہو اور بعض نکتہ چینیاں گراں گزریں لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ البیرونی کی غرض وغایت محض مورخانہ صدق وصحت تک پہنچنا اور اُسے بے تعصبی اور غیر جانبداری سے پیش کردینا ہے اور وہ یہ بات نظر انداز نہیں کرسکتے کہ البیرونی نے ان کی تہذیب وتمدن کا ذکر بے حد مدح وستایش کے ساتھ کیا ہے۔''

محمد خالد حسین نیموی قاسمی *

شہرۂ آفاق محدثین کا فقہی رجحان اور مسلکی مزاج

احکام شریعت کو تفصیلی دلائل کے ساتھ جاننے کا نام فقہ ہے۔اسی طرح ان چیزوں کے جاننے کو بھی 'فقہ' کہتے ہیں جو نفس کے لیے مفید یا مضر ہیں۔ بالفاظ دیگر 'فقہ' نفس کے حقوق و فرائض جاننے کا نام ہے۔"**والفقہ معرفة النفس ما لها و ما عليها.**"[1] 'فقہ' درحقیقت اسلامی تعلیمات کا نچوڑ، قرآن کریم اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مستفاد اور ان کا خلاصہ ہے۔قرآن کریم میں **تفقُّه فی الدین** کی ضرورت و اہمیت کو اللہ تعالیٰ نے سورہ توبہ آیت:۱۲۲ میں یوں بیان فرمایا ہے:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ.

ترجمہ: اور مسلمانوں کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ سب کے سب جہاد کے لیے نکل کھڑے ہوں؛ سو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک گروہ جایا کرے تاکہ وہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو متنبہ و آگاہ کریں تاکہ وہ گناہوں سے بچ سکیں۔

---

* اکیڈمک انچارج، بدرالاسلام ڈگری کالج، بیگوسرائے (بہار)

فقہ سراپا خیر ہے اور **تفقّہ فی الدین** ایک عظیم نعمت ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: **من یُرد اللّٰہ بہ خیرًا یُفقّھہ فی الدین.** ''جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں؛ اس کو دین کی سمجھ عطا فرماتے ہیں۔'' [۲] سیدنا عمر فاروقؓ ارشاد فرماتے ہیں: ''**تَفَقَّھُوْا قَبْلَ أَنْ تُسَوَّدُوْا**'' [۳] سردار بنائے جانے سے پہلے تفقہ حاصل کرو یا بالوں کی سفیدی سے پہلے فقہ اور دین کا فہم حاصل کرو۔

صاحب کنز العمال لکھتے ہیں:

> ''حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جب کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو اہل الرائے اور اہل الفقہ کو مشورہ کے لیے بلا لیتے، مہاجرینؓ وانصارؓ میں سے اہلِ علم کو بلاتے، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ کو بلاتے، یہی لوگ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ خلافت میں فتویٰ دیا کرتے تھے، پھر حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ ہوئے وہ بھی انہی حضرات سے مشورہ لیا کرتے تھے اور فتویٰ کا مدار انہی حضرات پر تھا۔ [۴]

امام محمد بن ادریس شافعیؒ (المتوفی ۲۰۴ھ) فرماتے ہیں: ''ائمہ کرام نے جتنی باتیں بیان فرمائی ہیں وہ سب حدیث ہی کی شرح ہیں اور پورا ذخیرہ احادیث قرآنِ کریم کی شرح ہے۔''

> ''**وقال الإمام الشافعی، رضی اللّٰہ عنہ: جمیع ما تقولہ الأمۃ شرح للسنۃ، وجمیع شرح السنۃ شرح للقرآن**''. [۵]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو جب کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عام صحابہ کو جب کسی مسئلے کا حکم معلوم کرنا ہوتا تو وہ فقہائے صحابہ سے تحقیق کرتے یہ سلسلہ عہد تابعین میں بھی جاری رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ نفوس قدسیہ کو فقہ اسلامی کی تدوین کے لیے قبول فرمالیا۔

مذکورہ روایت سے یہ بھی ظاہر ہے کہ عام طور پر صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ کرنے والے اور آپ کی احادیث کو جاننے والے تھے، مگر اہل الرائے اور اہل الفقہ صرف فقہاء

صحابہؓ ہی تھے، جن کی تعداد مختصر تھی، علامہ ابن القیم نے اعلام الموقعین میں تفصیل سے فقہاء صحابہ کی تفصیل درج کی ہے۔

فقہ اور حدیث میں ربط

سلف صالحین کے نزدیک 'فقہ' حدیث سے جدا کوئی چیز نہ تھی، یہ قرآن وحدیث کی ہی تفسیر ہوتی تھی، اسے قرآن وحدیث سے الگ کر کے پیش کرنا اور اسے محض رائے سمجھ لینا بدنیتی پر مبنی طرز عمل ہے۔ سوید بن نصرؒ جو کہ امام ترمذیؒ اور امام نسائیؒ کے شیوخ میں سے ہیں، فرماتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن مبارکؒ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے:

''لاتقولوا رای ابو حنیفة ولکن قولوا تفسیر الحدیث.''[۶]

یہ نہ کہا کرو ابوحنیفہ کی رائے بلکہ کہو یہ حدیث کی شرح اور تفسیر ہے۔

سچائی یہ ہے کہ 'فقہ' قرآن وسنت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے، فقہ کے خلاف ذہن بنانا درحقیقت خود حدیث سے بدگمان کرنا ہے۔

تدوین فقہ کی ضرورت

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب، تاریخ علم فقہ میں لکھتے ہیں:

''عہدِ رسالت کے بعد جب اسلام کی حدود بہت بڑھ گئیں، قیصر وکسریٰ کی حکومتیں اسلام کے زیر نگیں ہوگئیں، یورپ میں اندلس تک افریقہ میں مصر اور شمالی افریقہ تک اور ایشیا میں ایشیائی ترکستان اور سندھ تک اسلام پھیل گیا تو اسلام کو نئے تمدن، نئی تہذیب اور نئی معاشرتوں سے سابقہ پڑا'' وسائل اور مسائل کی نئی نئی قسمیں پیدا ہوگئیں تو تابعین کے آخر عہد میں علمائے حق کی ایک جماعت نے کتاب وسنت کو سامنے رکھ کر اس کے مقرر کردہ قوانین و حدود کے مطابق ایک ایسا ضابطہ حیات مرتب کرنا چاہا جو ہر حال میں مفید، ہر طرح مکمل اور ہر جگہ قابل عمل ہو''۔[۷] یہی ضابطہ حیات 'فقہ' ہے۔

فقہ قرآن وسنت کا ثمرہ

فقہ دراصل قرآن وسنت ہی کی عملی تفسیر ہے۔ حدیث کا علم اور اس سے شغف جتنا ایک محدث کو ہوتا ہے؛ اتنا ہی ایک فقیہہ کو بھی، اگر محدثین کا الفاظِ احادیث پر زیادہ زور رہتا ہے تو فقہاء کے یہاں ان کے معانی پیش نظر رہتے ہیں، چنانچہ امام بخاری فرماتے ہیں:

'فقہ' سہل الحصول کے ساتھ ساتھ حدیث کا ہی ثمرہ ہے اور آخرت میں فقیہ کا ثواب محدث کے ثواب سے کم نہیں ہے۔[۸]

فقہاء اطباء ہیں اور ہم صیادلہ

اور یہی نہیں کہ حدیث وفقہ میں انتہائی گہرا ربط ہے؛ بلکہ امام اعمش تو یہاں تک کہہ گئے کہ ''اے فقیہو! آپ لوگ طبیب ہیں، اور ہم دوافروش ہیں'' اس سلسلے کے واقعہ کو اصحابِ تاریخ نے تفصیل سے لکھا ہے۔

ابو وہب عبیداللہ بن عمرو جزری اسدی کہتے ہیں کہ میں حضرت اعمش کی مجلس میں حاضر تھا کہ ایک آدمی ان کے پاس آیا اور ان سے ایک مسئلہ پوچھا تو انہوں نے اس کا جواب نہیں دیا۔ حضرت ابوحنیفہ بھی وہیں تشریف فرما تھے۔ حضرت اعمش نے ان سے کہا کہ آپ جواب دیں۔ انھوں نے تشفی بخش جواب دیا۔ حضرت اعمش نے دریافت کیا کہ آپ نے کہاں سے یہ جواب دیا تو انھوں نے کہا: فلاں فلاں حدیث آپ نے ہم سے بیان کی، انھیں کی روشنی میں میں نے یہ جواب دیا۔ حضرت اعمش نے کہا، اے گروہ فقہاء، تم لوگ طبیب ہو اور ہم دوافروش پنساری ہیں۔

قال أبو وهب عبيد الله بن عمرو الجزری الأسدی: كنت في مجلس الأعمش فجاءه رجل فسأله عن مسألة فلم يجبه فيها، ونظر فإذا أبو حنيفة فقال: يا نعمان، قل فيها فقال أبوحنيفة: القول فيها كذا، فقال الأعمش: من أين قلت؟ فقال أبو حنيفة: من حديث كذا أنت حدثتناه، فقال الأعمش يا معشر الفقهاء أنتم الأطباء ونحن الصيادلة.[۹]

آثار واحادیث سفیان کے پاس ان کے دقائق ابوحنیفہ کے پاس

عبداللہ بن داؤدؒ کہتے ہیں:

''جب کوئی آثار یا حدیث کا قصد کرے تو (اس کے لیے) سفیانؒ ہیں اور جب آثار یا حدیث کی باریکیوں کو معلوم کرنا چاہے تو اس کے لیے امام ابوحنیفہؒ ہیں۔''[۱۰]

صحاح ستہ کے مصنفین کا طرز عمل

ائمہ حدیث میں سے امام بخاری اور امام مسلم نے اپنی کتابوں میں احادیث کے بڑے ذخیرے سے اعلیٰ درجہ کی صحیح احادیث کا انتخاب فرمایا۔ اس کے ساتھ امام بخاری نے تراجم میں اپنے تفقہ کو سمو دیا ہے۔ امام ترمذی، امام ابوداؤد، امام نسائی، امام ابن ماجہ، امام دارمی وغیرہ حضرات نے اصل کوشش اس پر صرف کی کہ فقہائے کرام کے مستدلات یکجا کر دیئے جائیں، تاکہ فقہاء کی آراء کے مآخذ واضح ہو جائیں، اور یہ واضح کر دیا جائے کہ جو مسلک چل رہا ہے اس کے پیچھے دلائل کیا ہیں اور ان دلائل کی حیثیت کیا ہے۔ گویا ان کتب حدیث کی ابواب فقہیہ پر ترتیب ہی اس امر کی عکاسی کرتی ہے کہ 'فقہ الحدیث' ہی ان کے مصنفین کا بنیادی محور ہے۔ امام ترمذی نے اس امر کا بھی اہتمام کیا ہے کہ جن فقہاء کا ان احادیث پر عمل ہے ہر باب میں اسے بھی درج کیا ہے۔

فقہی مکاتب

یوں تو شروع میں بہت سے فقہی مکاتب وجود میں آئے؛ لیکن مستقل حیثیت چار ہی کو حاصل رہی۔ اور بتدریج امت انھیں چار پر مجتمع ہوگئی۔ اگرچہ انفرادی اجتہاد کا رنگ بعد میں بھی متعدد اہل علم کے یہاں نظر آتا ہے۔

علامہ عبدالحی لکھنوی لکھتے ہیں:

''فقد وجد بعدهم أيضا أرباب الاجتهاد المستقل كأبي ثور

البغدادی و داود الظاهری و محمد بن إسماعیل البخاری وغیرهم علی ما [لا] یخفی علی من طالع کتب الطبقات."[11]

''ان کے بعد بھی اجتہاد مستقل والے حضرات ہوئے ہیں جس طرح کہ ابوثور بغدادی، داؤد ظاہری اور محمد بن اسماعیل بخاری وغیرہ ہیں، جس نے کتب طبقات کا مطالعہ کیا ہے اس پر یہ بات پوشیدہ نہیں ہے۔''

لیکن ایک مسلک کے طور پر امت نے ان کے اجتہادات کو قبول نہیں کیا۔

مذاہب اربعہ بمنزلہ شرح

مذاہب اربعہ کو ہی اعتبار اور قبولیت حاصل رہی ہے... یہ مذاہب اربعہ بھی علیحدہ کچھ نہیں تھے بلکہ دین شریعت کی عملی شکلیں تھیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

مذهب فاروق اعظم بمنزلة متن است ومذاهب اربعة بمنزلئه شروح ...[12]

حضرت عمر فاروقؓ کا مذہب متن کی طرح ہے۔ اور حضرات ائمہ اربعہؒ کے مذاہب اس کے شروح کی مانند ہیں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی بھی محدث فقہ سے مستغنی نہیں ہوسکتا، البتہ ذیل کے سطور میں اس امر کا جائزہ لیا جائے گا کہ وہ محدثین جنھوں نے بے انتہا جانفشانی اور کافی تحقیق وتدقیق اور چھان پھٹک کرنے کے بعد امت مسلمہ کے سامنے حدیث کا عظیم سرمایہ پیش کیا، جن کی لازوال قربانیوں کے نتیجے میں اسلام کا دوسرا ماخذ تشریع محفوظ ہوا، بالخصوص صحاح ستہ ودیگر مستند کتب حدیث کے مصنفین کا فقہی ذوق اور مسلکی رجحان کیا تھا، چونکہ مشہور مصنفین کتب حدیث کا زمانہ عام طور پر ائمہ اربعہ کے بعد کا ہے، اس لیے یہ بھی جائزہ لیا جائے گا کہ ائمہ اربعہ میں سے کس امام کے مسلک سے یہ حضرات مربوط رہے ہیں۔

ائمہ محدثین کا اپنے اکابر سے استفادہ

اس سلسلے میں ایک متفق علیہ حقیقت یہ ہے کہ ائمہ محدثین اپنی تمام تر علمیت اور جلالت شان

کے باوجود عام طور پر ائمہ مجتہدین، سلف صالحین اور اپنے بڑوں سے استفادہ کرتے تھے، ان کے علم وفضل پر اعتماد کرتے تھے، قرآن کریم کی آیات کی کو جو تفسیر اور احادیث کی جو تشریح ان کے اساتذہ وشیوخ کرتے تھے اسے وہ معتبر سمجھتے تھے، مجتہد فیہ مسائل میں اپنے شیوخ کے اقوال، آراء اور منہج سے استفادہ کرتے تھے اور ان کی آراء واقوال کے مطابق فتوی دیا کرتے تھے؛ بلکہ ان کی تقلید بھی کرتے تھے۔

تقلید واتباع کے مراتب

تقلید کے تین درجات ہیں: اول یہ کہ اپنے سے بڑے کے قول کو محض ان پر حسن ظن اور اعتماد کرتے ہوئے تسلیم کرنا، دلیل ہو یا نہ ہو۔ دوم یہ کہ اپنے سے بڑے کے قول کو حسن ظن کی بنیاد پر بغیر مطالبہ دلیل کے تسلیم کرنا۔ دلیل اگر چہ اپنے مقام پر موجود ہو، لیکن مقلد اپنے سے بڑے کی بات ماننے میں دلیل کا محتاج نہ ہو۔ تیسرا درجہ یہ ہے مجتہد فیہ مسائل میں کسی بڑے کی رائے اور اجتہاد کی اتباع علی وجہ البصیرۃ کرنا، یا ان کی تحقیق تفسیر پر اعتماد کرنا یا ان کے اصول کے مطابق مسائل کا استنباط یا تخریج کرنا... کبار اہل علم وتحقیق اور شہرہ آفاق محدثین کے بارے میں تقلید کے پہلے اور دوسرے درجے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔

حسن ظن کی بنیاد پر بلا مطالبہ دلیل بات مان لینا

تقلید کا اطلاق جب کبار اہل علم محدثین پر کیا جاتا ہے تو یہی تیسرا درجہ مقصود ہوتا ہے۔ **قال الشافعیؒ فی مواضع من الحجج قلته تقلیدا لعطاء...** [۱۳] حضرت امام شافعیؒ نے بہت سے مقامات میں کہا ہے کہ میں نے حضرت عطاءؒ کی تقلید میں یہ کہا ہے۔

حضرت امام شافعیؒ جیسے محدث مجتہد اور فقیہ حضرت عطاءؒ سے حسن ظن کی بناء پر احتجاج کرتے ہیں۔ اور صاف کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عطاءؒ کی تقلید کرتے ہوئے ایسے کہا ہے...

علامہ خطیب بغدادیؒ اور حافظ ابن حجرؒ نقل کرتے ہیں کہ ایک مسئلہ کی تحقیق میں ایک سائل نے کہا کہ اس میں تو کوئی صحیح حدیث موجود نہیں ہے اس پر حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ اگر حدیث موجود نہیں تو نہ سہی، اس میں حضرت امام شافعیؒ کا قول تو موجود ہے۔ اور حضرت امام شافعیؒ

کا قول تو ایک مستقل حجت اور دلیل ہے۔ **ففیه قول الشافعي و حجته، اثبت شئی فیه.**[۱۴]

امام احمد بن حنبل کے سامنے کسی نے ابومنذر کی تعریف کی، تو آپ نے فرمایا میں اس کو نہیں جانتا۔ پھر آپ نے کہا کہ لیکن حیرت ہے کہ تم عبداللہ بن عبدالرحمٰن (دارمی) سے واقف نہیں ہو پھر آپ نے تاکید کے ساتھ فرمایا تم اس سردار کے حلقۂ فیض سے وابستہ رہنا یہ چیز تمہارے لیے ضروری اور لازم ہے۔ **(لکن این انت عن عبد اللّٰه بن عبد الرحمن علیک بذاک السید علیک بذاک السید.**

اسی طرح ایک موقع پر امام احمد بن حنبل سے یحیٰی بن حمانی کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ہم نے امام دارمی کے قول کی بناء پر اس کو چھوڑ دیا ہے کیونکہ وہ امام ہیں۔ **ترکناه بقول عبد الله بن عبد الرحمن لانه امام.**[۱۵]

امام و مجتہد تقلید کرتے ہیں

نواب صدیق حسن قنوجی لکھتے ہیں کہ ہر امام اور مجتہد اپنے سے زیادہ علم والے کی بعض احکام و مسائل میں تقلید کرتے تھے۔

فلا تجد احدا من الائمة الا و هو مقلد من هو اعلم منه فی بعض الاحکام...[۱۶]

تم حضرات ائمہ کرامؒ میں سے کسی ایک کو بھی نہیں پا سکتے کہ وہ بعض مسائل میں اپنے سے کسی بڑے عالم کی تقلید نہ کرتے ہوں۔

تقلید کے جائز اور درست ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ سلف صالحین کا ہمیشہ سے اس پر عمل رہا ہے۔ بڑے بڑے اہلِ علم محدثین اور فقہاء بھی تقلید پر عمل پیرا تھے لیکن ان کی تقلید کسی عامی یا ہمہ شما کی تقلید کی طرح نہیں تھی؛ بلکہ ان میں سے کئی حضرات اجتہاد کے مقام پر فائز تھے، پھر بھی احتراماً یا احتیاطاً ان کا طرزِ عمل یہ تھا کہ منصوص مسائل میں قرآن و حدیث کی جو تفسیر ان سے بڑے فقہاء نے کی، اس پر اعتماد کرتے تھے اور اسی کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے اسی طرح مجتہد فیہ مسائل میں ان مجتہدین کی رائے اور اجتہاد پر عمل کرتے تھے بطورِ نمونہ چند اہم نام یہاں ذکر کئے جاتے ہیں:

(۱) لیث ابن سعد مصری (متوفی ۱۷۵) بڑے محدث اور ممتاز فقیہ ہیں، اپنی فقاہت اور تبحر علمی کے ساتھ مجتہدانہ شان رکھتے ہیں۔اس کے باوجود فقہ میں کثرت سے وہ امام ابوحنیفہ سے استفادہ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ متعدد اہل علم انھیں حنفی المسلک شمار کرتے ہیں۔مشہور اہل حدیث عالم نواب صدیق حسن خان تحریر فرماتے ہیں:''وے حنفی مذہب بود و قضائے مصر داشت''[۱۷] یعنی لیث بن سعد حنفی المذہب تھے اور مصر کے قاضی کے طور پر خدمات انجام دیا کرتے تھے۔

وقال الشافعي: لليث أفقه من مالک، إلا أن أصحابه لم يقوموا به. [۱۸] امام شافعی کہتے ہیں کہ لیث بن سعد امام مالک سے بھی بڑے فقیہ تھے؛ لیکن انھیں ایسے اصحاب اور تلامذہ نہیں ملے جو ان کے علوم کی تدوین واشاعت کریں۔

موصوف کے بارے میں علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ فقہ حنفی کے دلدادہ تھے۔

ألمّ بفقه أبي حنيفة ومالک بل وكان على اتصال بمالک من خلال المراسلات. [۱۹]

شارح بخاری علامہ عینی نے لکھا ہے کہ لیث بن سعد امام شافعی کے استاذ ہیں، اور فقہی نقطہ نظر سے حنفی ہیں۔(عمدۃ القاری)

(۲) امیر المومنین فی الحدیث عبداللہ بن مبارکؒ۔(م :۱۸۱ھ) جماعتِ محدثین کے سرخیل ہیں۔وہ بھی کثرت سے امام ابوحنیفہ سے استفادہ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ علامہ ابوالولید باجی مالکی نے لکھا ہے کہ وہ بھی امام ابوحنیفہؒ کے اصحاب ومقلدین میں سے ہیں۔[۲۰]

(۳) وکیع بن جراحؒ (متوفی ۱۹۷ھ) بڑے بلند پایہ محدث ہیں اور امام شافعیؒ جیسے جلیل القدر محدث اور فقیہ ان کے تلامذہ میں سے ہیں۔ یہ بھی کثرت سے امام ابوحنیفہ کے اقوال سے استفادہ کرتے ہیں۔اہل علم نے لکھا ہے کہ وہ بھی امام ابوحنیفہؒ کے اقوال کی تقلید کرتے تھے اور اس کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے۔حافظ شمس الدین ذہبی کا بیان ''**كان يفتي بقول ابي حنيفة.**[۲۱] امام وکیع بن الجراح کی علمی منزلت اور فن حدیث میں مرکزی حیثیت اہلِ علم سے مخفی نہیں ہے، صحیح بخاری اور صحیح مسلم آپ کی مرویات سے بھری پڑی ہیں، علمِ حدیث کے ایسے بالغ نظر علماء کا امام ابوحنیفہؒ سے حدیث سننا اور پھر ان کا اس قدر گرویدہ ہوجانا کہ انہی کے قول پر فتویٰ دینا حضرت امام کی علمی منزلت کی ناقابلِ انکار تاریخی

شہادت ہے، حافظ ابنِ عبدالبر مالکیؒ امام الجرح والتعدیل یحییٰ بن معین سے نقل کرتے ہیں:

''وکان (وکیع) یفتی برأی أبی حنیفة وکان یحفظ حدیثه کله وکان قد سمع من ابی حنیفة حدیثاً کثیراً.'' [۲۲]

ترجمہ: حضرت وکیع حضرت امام ابوحنیفہؒ کی فقہ کے مطابق فتویٰ دیتے تھے اور آپ کی روایت کردہ تمام احادیث یاد رکھتے تھے اور انہوں نے آپ سے بہت سی احادیث سنی تھیں۔

حافظ شمس الدین الذہبیؒ (۷۴۸ھ) بھی وکیع کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

''وقال یحیی: مارأیت افضل منه یقوم اللیل ویسرد الصوم ویفتی بقول ابی حنیفة.'' [۲۳]

(۴) حضرت یحییٰ بن سعید القطانؒ (وفات ۱۹۸ھ) مشہور ناقد حدیث، ناقد اسانید، اسماء رجال کے امام اور سید الحفاظ ہیں۔ یہ بھی حنفی المسلک تھے اور فقہ حنفی کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے۔ حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجرؒ کا بیان ہے: ''کان یحییٰ یفتی بقول ابی حنیفة'' [۲۴]

(۵) یحییٰ بن معینؒ (متوفی ۲۳۳ھ) جرح وتعدیل کے امام اور حدیث میں استاذ الاساتذہ ہیں۔ ان کے بارے حافظ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ ان کا شمار راسخ حنفیوں میں تھا۔ [۲۵]

(۶) امیر المومنین فی الحدیث، امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ (متوفی ۲۵۶ھ) محتاج تعارف نہیں، امت مسلمہ کا بچہ بچہ آپ سے متعارف ہے۔ آپ حدیث کی امامت کے ساتھ فقہ میں بھی مجتہدانہ شان رکھتے تھے، ان کی فقاہت تراجم بخاری میں بجا طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ ''فقه البخاری فی تراجمه'' امام شافعی کے اجتہادی اصول کی پیروی کیا کرتے تھے، انھیں علامہ سبکیؒ نے فقہائے شوافع میں شمار کیا ہے۔ [۲۶] نیز مشہور اہل حدیث عالم نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ کو بھی ان کے شافعی المذہب ہونے کا اعتراف ہے۔ [۲۷]

امام بخاری پر فقہ شافعی کے اثرات ان کے استاذ عبداللہ بن الزبیر حمیدی کی وجہ سے تھا۔ شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی نے ''انصاف'' میں اس کو نہایت تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی امام بخاری کے سلسلے میں فرماتے ہیں: ''واما البخاری فهو وان

کان منتسبا الی الشافعی موافقاله فی کثیر من الفقه فقد'' **''خالفه ایضا فی کثیر الی آخره''** یعنی کثرت موافقات کے سبب امام بخاری کو امام شافعی کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ جس کثرت سے موافقت ہے اسی طرح امام شافعی کی مخالفت بھی موجود ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیری امام بخاری کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

> **واعلم أن البخاری مجتهد لا ریب فیه وما اشتهر أنه شافعی فلموافقته إیاه فی المسائل المشهورة و إلا فموافقته للإمام الأعظم لیس بأقل مما وافق فیه الشافعی، وکونه من تلامذة الحمیدی لا ینفع لأنه من تلامذة إسحاق بن راهویه أیضا فهو حنفی، فعده شافعیا باعتبار الطبقة لیس بأولی من عده حنفیا.** [۲۸]

عبارت مذکورہ کا خلاصہ یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ مجتہد تھے اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے، اور یہ جو مشہور ہے کہ آپ شافعی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ مسائل مشہورہ میں امام شافعی رحمہ اللہ سے موافقت کرتے ہیں، اگر یہ بات کہی جائے کہ امام بخاری رحمہ اللہ امام حمیدی رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں جو کہ شافعی ہیں تو یہ بات بھی اس کے لیے دلیل اور فائدہ مند نہیں ہے کیونکہ آپ اسحاق بن راہویہ کے بھی شاگرد ہیں جو حنفی ہیں۔ رہی بات امام شافعی سے موافقت والی تو آپ نے بہت سے مسائل میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے موافقت کی ہے۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا کے حوالے سے مولانا عاشق الٰہی تحریر فرماتے ہیں:

> ''میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ پختہ طور پر مجتہد تھے، اگر امام صاحب کو مقلد مان لیا جائے تو یہ ہمارے جیسے مقلد نہیں کہلائیں گے کہ جو امام نے کہہ دیا بس اسی پر عمل کر لیا''۔ [۲۹]

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نے امام بخاری کے بارے میں جو فرمایا کہ وہ ہمارے جیسے مقلد نہیں تھے اس کا اطلاق تمام کبار اہل علم پر ہوتا ہے۔

(۷) امیر المومنین فی الحدیث امام مسلم بن الحجاج القشیری، قرآن کریم کے بعد دوسری صحیح ترین

کتاب ''صحیح مسلم'' کے مصنف ہیں . ان کے بارے میں علامہ شیخ محسن بن یحییٰ خضری ترہتی کی شہادت ہے کہ وہ شافعی المسلک تھے، دیگر اہل علم نے بھی اس کی نشاندہی کی ہے۔[۳۰]

(۸) امیر المومنین فی الحدیث امام محمد بن عیسی ترمذی؛ علامہ انور شاہ کشمیری رح کے بقول شافعی المسلک ہیں۔(عرف الشذی) بعض نے حنبلی کہا ہے(الانصاف) بہر حال اصحاب تقلید میں سے ہیں۔

(۹) امام ابوداؤدؒ (متوفی ۲۷۵ھ) مشہور ومعروف محدث ہیں ان کے بارے میں نواب صدیق حسن خاں کا کہنا ہے کہ ان کے فقہی ذوق کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ شافعی تھے یا حنبلی تھے۔[۳۱] اس اختلاف کے باوجود یہ بات طے شدہ ہے کہ امام ابوداؤد بہر حال اہل تقلید میں سے ہیں۔

(۱۰) امام محمد ابن شعیب نسائی (متوفی ۳۰۳ھ) مشہور محدث ہیں اور حدیث کی مشہور کتاب ''سنن نسائی'' کے مؤلف ہیں۔ان کے بارے میں بھی علماء نے لکھا ہے کہ وہ فقہ شافعیؒ کے مقلد تھے۔ خودنواب صاحب کواعتراف ہے کہ یہ شافعی المذہب تھے۔''**وکان شافعی المذهب**''.[۳۲] اس پر ان کی اپنی کتاب ''منسک'' بھی دلالت کرتی ہے۔

(۱۱) امام ابن ماجہ(۲۰۹-۳۲۸ھ) کے بارے میں علامہ کشمیری کی صراحت ہے کہ وہ شافعی المسلک ہیں۔(العرف الشذی) بعض حضرات نے انھیں حنبلی کہا ہے۔(الانصاف) بہر حال وہ تقلید کرتے ہیں۔

(۱۲) امام اسحاق راہویہ، (۱۶۱ھ-۲۳۸ھ/ ۷۷۸-۸۵۳م)، مشہور محدث ہیں ان کے بارے میں ابن حبان نے کہا کہ وہ فقاہت، ورع وتقوی اور علم وحفظ کی جامعیت میں اپنے زمانے کے سردار تھے۔امام احمد نے فرمایا کہ وہ میرے نزدیک ائمہ میں سے ایک امام ہیں، عراق میں ان کے مثل کوئی نہیں۔اگر چہ مجھ سے متعدد مسائل میں اختلاف رکھتے ہیں لیکن یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے اس لیے کہ اہل علم میں بالعموم اختلاف رہا ہے۔

> **قال ابن حيان ''كان إسحاق من سادات أهل زمانه فقهاً وورعاً و علماً و حفظاً'' وقال أحمد لک يعبر الجسر إلى خراسان مثله وهو عندنا إمام أئمة المسلمين،وقال لا أعرف**

لـه فـي العراق نظيراًو إن كان يخالفنا في أشياء؛ فإن الناس لم يزل يخالف بعضهم بعضا.

اسحٰق بن راہویہ کو علامہ سبکیؒ نے شوافع میں شمار کیا ہے۔ چوں کہ آپ کے اساتذہ میں امام شافعی بھی شامل ہیں۔[۳۳] علامہ انور شاہ کشمیری کی تحقیق میں آپ حنفی ہیں۔

لأنه من تلامذة إسحاق بن راهويه أيضا فهو حنفي.[۳۴]

ایک رائے یہ ہے کہ موصوف خود مجتہد تھے۔

(۱۳) امام ابو یوسف: **يـعـقـوب بـن إبـراهيـم بـن حبيـب الأنـصـاري الـكـوفـي البـغـدادي**، (۱۱۳-۱۸۲ھ/ ۷۳۱-۷۹۸م) عظیم محدث اور عالی مرتبت فقیہ ہیں، محدثین لکھتے ہیں:

كان فقيها علامة، من حفاظ الحديث.

وتـفـقـه بـالـحـديث والرواية، ثم لزم أبا حنيفة، فغلب عليه. الرأى(الاعلام للـزكـلي) لیکن حدیث وفقہ میں جلالت شان کے باوجود اپنی فقاہت اجتہاد کو اپنے استاذ امام ابوحنیفہ کے تابع کردیا اور دنیا انھیں فقہ حنفی کے ''شیخین'' اور ''صاحبین'' میں سے ایک کے طور پر جانتی ہے۔

(۱۴) **مشهـور مـحـدث دار قـطـنـي حـافـظ أبـو الحسن علي بن عمر بن أحمد البغدادي.** (۳۰۶ھ-۳۸۵ھ) یہ بھی شوافع میں شمار کئے گئے ہیں۔[۳۵]

(۱۵) امام دارمی، عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی (۱۸۱-۲۵۵) مشہور محدث ہیں، ان کی کتاب سنن دارمی کو اہل علم کے نزدیک بڑی اہمیت ہے، بعض نے ابن ماجہ کی جگہ اسے صحاح ستہ میں شامل کیا ہے، اسی بات کی طرف ابن حجر رحمہ اللہ نے اشارہ کیا ہے کہ سنن دارمی دیگر سنن کتب سے درجے میں کم نہیں ہے اگر اس کو کتب اربعہ میں شامل کردیا جاتا تو یہ بہتر تھا۔[۳۶]

اکثر علماء کا کہنا ہے کہ اگر دارمی کو کتب ستہ میں شامل کرلیا جاتا تو یہ بہتر تھا، جس میں ابن صلاح، امام نووی، صلاح الدین العلائی اور ابن حجر رحمہ اللہ کے نام شامل ہیں۔[۳۷]

سنن دارمی میں ابواب کی بہترین فقہی ترتیب سے امام دارمی رحمہ اللہ کا حدیث کے ساتھ فقہ میں نمایاں مقام ومرتبہ بھی ظاہر ہوتا ہے ۔ان کے بارے میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا بیان ہے کہ وہ حنبلی المسلک ہیں......[۳۸]

(۱۶) مشہور محدث ابوعوانہ اسفرائنیؒ (متوفی ۳۱۶ھ) کا شمار بھی اسی فہرست میں ہوتا ہے۔ان کی مشہور ومعروف کتاب **"صحیح ابو عوانہ"** ہے۔حضرت کا رجحان مسلک شافعی کی طرف تھا۔حافظ ذہبی نے اس ذوق کی نشاندہی کی ہے۔[۳۹]

(۱۷) مکی بن ابراہیم، (۱۲۶-۲۱۴ھ) بڑے پایہ کے محدث ہیں۔امام اعظم ابوحنیفہ کے شاگرد ہیں اور امام بخاری کے عظیم اساتذہ میں سے ہیں۔بخاری شریف کی ایک عظیم خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی صحیح میں بائیس روایات ثلاثیات میں سے ذکر کی ہیں؛ یعنی ایسی روایات جن میں صرف تین راویوں کا واسطہ ہے، ان میں سے گیارہ روایات انھی مکی بن ابراہیم کی سند سے روایت کرتے ہیں . ان کا رجحان امام ابوحنیفہ کی طرف تھا۔مکی بن ابراہیم کا قول ہے کہ امام ابوحنیفہ رضی اللہ روئے زمین پر سب سے بڑے عالم تھے۔

قال مکی بن إبراهيم: كان أبو حنيفة أعلمَ أهلِ الأرض. [۴۰]

اتفاق کی بات یہ ہے کہ مکی بن ابراہیم کے علاوہ ثلاثیات روایت کرنے والے دیگر تینوں راوی بھی امام ابوحنیفہ کے شاگرد ہیں۔

(۱۸) امام محمد بن حسن شیبانی، فقہ وشریعت میں مہارت کے ساتھ حدیث کے بھی امام ہیں۔انھیں امام دارقطنی جیسے محدث نے یحییٰ بن سعید قطان اور عبداللہ بن مبارک کے معیار کا ثقہ اور حافظ قرار دیا

حدث به عشرون نفراً من الثقات الحفاظ منهم محمد بن الحسن الشيباني، ويحيى بن سعيد القطان وعبد الله بن المبارک وعبد الرحمن بن مهدی وابن وهب وغيرهم. [۴۱]

ان کے بارے میں علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ وہ تمام علوم بالخصوص علم فقہ کے سمندر تھے، اور امام مالک سے مضبوطی کے ساتھ روایت کرتے ہیں: **"وكان من بحور العلم والفقه، قوياً فی مالک"** [۴۲] امام محمد فقہ میں امام شافعی اور امام احمد بن حنبل جیسے جلیل القدر ائمہ کے استاذ ہیں۔

وقال المزنی سمعت الشافعی، يقول أَمَنُّ الناس عليّ فی الفقه محمد بن الحسن. امام مزنی کہتے ہیں کہ میں نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ مجھ پر فقہ کے

سلسلے میں تمام لوگوں میں سب سے بڑا احسان امام محمد کا ہے۔ میں نے دو اونٹ بوجھ کے بقدر ان سے علم حاصل کیا۔

قال إبراهيم الحربی قلت للإمام أحمدمن أين لک هذه المسائل الدقاق؟ قال من کتب محمد بن الحسن. ابراہیم حربی کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد سے دریافت کیا کہ اتنے دقیق مسائل آپ کہاں سے اخذ کرتے ہیں تو انھوں نے کہا کہ امام محمد بن حسن کی کتابوں سے۔[۴۳] اس عظمت کے باوجود امام محمد نے اپنے اجتہاد کو امام ابوحنیفہ کے اجتہاد کے تابع کر دیا اور تاحیات اپنے شیخ کے علوم اور ان کی فقہ کی تدوین میں مصروف رہے ۔

(۱۹) امام بیہقی: احمد بن حسین بن علی بن موسی ابوبکر (۳۸۴-۴۵۸ھ/۹۹۴-۱۰۶۶م) مشہور محدث اور متعدد کتب حدیث کے شہرہ آفاق مصنف ہیں، ان کا شافعی المسلک ہونا ظاہر باہر ہے۔ امام الحرمین شیخ ابوالمعالی جوینی کہتے ہیں کہ ہر شافعی المسلک، امام شافعی کا منت کش ہے؛ لیکن بیہقی امام شافعی کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ فقہ شافعی کی تائید میں انھوں نے بیش بہا کتابیں تصنیف کیں۔

قال إمام الحرمين ما من شافعی إلا وللشافعی فضل عليه غير البيهقی، فإن له المنة والفضل علی الشافعی لكثرة تصانيفه فی نصرة مذهبه وبسط موجزه وتأييد آرائه.

علامہ ذہبی کی شہادت ہے کہ وہ اس پایہ کے محقق تھے کہ ایک مستقل مذہب کی بنیاد رکھ سکتے تھے لیکن احتراماً اپنے اجتہاد کو امام شافعی کے تابع کر دیا۔

وقال الذهبی: لو شاء البيهقی أن يعمل لنفسه مذهبا يجتهد فيه لكان قادرا علی ذلک لسعة علومه ومعرفته بالاختلاف.[۴۴]

(۲۰) امام ابوثور بغدادی (۱۷۰ھ) شہرہ آفاق محدث ہیں، انھیں اہلِ علم نے **الإمام، الحافظ، الحجة، المجتهد، مفتی العراق، الفقيه،** جیسے بلند القاب سے یاد کیا ہے۔[۴۵]

موصوف اجتہادی شان کے حامل تھے، شروع میں وہ حنفی تھے اور فقہ حنفی کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے ۔ امام شافعی سے ملاقات کے بعد شافعی ہو گئے تھے۔

وفی "العبر" برع فی العلم ولم يقلد أحداً وصنف كتباً فی

الأحكام جمع فيها بين الحديث و الفقه و كان حنفياً حتى قدم الشافعي العراق فاختلف إليه وتشفَّع .ذكره ابن خَلِّكان.

فقد قال الرافعي أبي ثور وان كان معدوداً في طبقات أصحاب الشافعي فله مذهب مستقل فهو مجتهد مطلق.[۴۶]

رافعی کہتے ہیں کہ ابوثور کا شمار اگر چہ فقہاء شافعیہ میں ہوتا ہے لیکن لیکن سچائی یہ ہے کہ وہ مجتہد مطلق ہیں۔

امام احمد بن حنبل سے کوئی مسئلہ دریافت کرتا تو وہ ان لوگوں کو مسئلہ دریافت کرنے کے لیے ابوثور کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔

وقال أبو العباس البراثي: كنت عند أحمد بن حنبل، فسأله رجل عن مسألة في الحلال و الحرام، فقال له أحمد: سل عافاك الله غيرنا، قال: إنما نريد جوابك يا أبا عبد الله، فقال: سل عافاك الله غيرنا، سل الفقهاء، سل أبا ثور.(وفيات الاعيان لابن خلكان)

(۲۱) امام طحاویؒ (متوفی ۳۲۱ھ) بڑے پایہ کے محدث ہیں اور مشکلاتِ حدیث کے حل میں ان کا جواب نہیں۔ موصوف کا حنفی المسلک ہونا عالم آشکارا ہے۔ آپ حنفی ہی نہیں بلکہ حنفیہ کے وکیل بھی ہیں۔ پہلے اپنے ماموں امام مزنی کے زیر اثر شافعی المسلک تھے۔[۴۷]

(۲۲) امام محمد بن عبداللہ عبدالحکم (متوفی ۲۰۸ھ) ان کا شمار بڑے حفاظِ حدیث میں ہے۔ یہ فقہ مالکی کے پیرو تھے۔

علامہ ذہبی لکھتے ہیں: "**احد فقهاء المصر من اصحاب مَالک**"[۴۸]

(۲۳) امام ابوبکر احمد بن محمد المروزی (متوفی ۲۷۵) بڑے ائمہ حدیث میں ہیں اور حنبلی المذہب ہیں۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں۔ "**اجل اصحاب احمد ابن حنبلؒ**"[۴۹] کتب سوانح کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ شہرہ آفاق محدثین کے فقہی مذاہب کے بارے میں متعدد آراء ہیں، گذشتہ سطور میں جو کچھ لکھا گیا وہ راجح قول کے مطابق ہے۔ اس کے علاوہ دیگر اقوال بھی ہیں؛ جو اپنے مقامات پر تفصیل سے مذکورہ ہیں۔

ائمہ متبوعین کس مسلک کے پیرو تھے؟

ایک سوال عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ دیگر محدثین وفقہاء ائمہ متبوعین کی تقلید کرتے تھے تو خود ائمہ متبوعین کس کی تقلید کرتے تھے۔اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو مجتہد پر تقلید لازم نہیں ہے؛ اس کے باوجود وہ احتراما یا احتیاطاً اپنے سے اوپر کے سلف صالحین کی تقلید کرتے تھے؛ اگر ان کے اقوال خاص مسئلہ میں موجود ہوتے؛ ان کی عدم موجودگی میں پیش آمدہ مسائل میں وہ اجتہاد کرتے تھے۔ چنانچہ اسی نسبت علمی کے بارے میں امام ابوحنیفہ سے مشہور عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور نے سوال کیا تھا۔ان کے جواب میں امام ابوحنیفہ نے کہا کہ میں نے حماد سے، انھوں نے ابراہیم نخعی سے اور انھوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے اور حضرت علی بن ابی طالب سے اور عبداللہ بن مسعود سے اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے سنا۔ایک روایت میں ہے کہ میں نے حضرت عمر کے تلامذہ سے اور حضرت علی کے تلامذہ سے اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے اصحاب سے اور عبداللہ بن عباس کے تلامذہ سے انھوں نے اپنے اساتذہ سے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسب فیض کیا۔

(عمن أخذتَ العلم يا أبا حنيفة؟

قال أبو حنيفة: دخلت على أبي جعفر المنصور أمير المؤمنين، فقال لي: يا أبا حنيفة، عمَّن أخذتَ العلم؟ قلت: عن حماد عن إبراهيم عن عمر بن الخطاب وعلى بن أبي طالب وعبد اللّٰه بن مسعود وعبد اللّٰه بن عباس... (تاريخ بغداد للخطيب)

وفي رواية؛ قال: عن أصحاب عمر عن عمر، وعن أصحاب علي عن علي، وعن أصحاب عبد اللّٰه عن عبد اللّٰه، وما كان في وقت ابن عباس على وجه الأرض أعلم منه... (الطبقات السنية)

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ودیگر ائمہ متبوعین سے پہلے فقہ مدون نہیں تھی؛ اس لیے اس سے پہلے کس

کی فقہ کو مانا جاتا تھا؟ یہ سوال ہی عبث ہے۔ جسے جس کی فقہ دلائل و براہین کی روشنی میں قابل اعتماد اور لائق اطمینان محسوس ہوئی؛ انھوں نے تسلیم کر لی۔ ہاں! فقہ بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ہے۔ فقہ قرآن وحدیث کا نچوڑ ہے کسی کی خانہ ساز نہیں۔ امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، اور امام مالک رحمہم اللہ کی فقہ پر امت مسلمہ کا عمل صدیوں سے رہا ہے۔ اس لیے تقلید پر بے بنیاد شبہات پیدا کرنا بڑی ناانصافی کی بات ہے۔

علماء حق نے ہر زمانہ میں ائمہ اربعہ کی عظمت اور ان کی فقہی خدمات کو کھلے دل سے تسلیم کیا ہے اور اپنی تمام تر قابلیت کے باوجود علی وجہ البصیرۃ ان کی تقلید کی راہ اختیار کی ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیری اس طرح گویا ہیں:

''ہر علم وفن میں اپنی مخصوص رائے رکھتا ہوں، کسی کا مقلد نہیں باستثنائے فقہ کہ اس میں میری کوئی رائے نہیں، ابوحنیفہ کی تقلید کرتا ہوں''[۵۰]

اور یہی سلامتی کی راہ بھی ہے کہ فقہاء محدثین کا ہمیشہ خیر کے ساتھ ذکر کیا جائے۔ ان کے علوم ومعارف سے استفادہ کیا جائے اور ان میں سے کسی ایک کی تشریح پر اعتماد کرتے ہوئے ہم دین پر عمل پیرا ہوں. ان کے اجتہادات اور فقہی اختلافات کو آپس کی مخالفت اور نزاع کا سبب نہ بنائیں۔ اس لیے کہ ہم اسی کے مکلّف ہیں اور ہمیں اسی عقیدہ کی تعلیم دی گئی ہے۔ امام طحاوی رقم طراز ہیں:

وَعُلَمَاءُ السَّلَفِ مِنَ السَّابِقِينَ، وَمَنْ بَعْدَهُمْ مِنَ التَّابِعِينَ – أَهْلِ الْخَيْرِ وَالْأَثَرِ، وَأَهْلِ الْفِقْهِ وَالنَّظَرِ – لَا يُذْكَرُونَ إِلَّا بِالْجَمِيلِ، وَمَنْ ذَكَرَهُمْ بِسُوءٍ فَهُوَ عَلَى غَيْرِ السَّبِيلِ. (العقيدة الطحاوية)

''اور علماء سلف صالحین جو پہلے گزر چکے ہیں اور اُن کا اتباع کرنے والے اور اُن کے بعد آنے والے بہتری اور نیکی والے لوگ اور حدیث نقل کرنے اور اہل فقہ (فقہ کے ماہر) اور نظر وقیاس والے بزرگ اُن سب کا ذکر سوائے نیکی کے درست نہیں اور جو شخص اُن کو برائی سے ذکر کرے گا وہ راہِ راست پر نہیں ہوگا۔''

حواشی

۱۔ شرح التلویح علی التوضیح،۱/۱۶
۲۔ صحیح بخاری، رقم:۶۴۹۶
۳۔ بخاری، کتاب العلم ۱/۲۵
۴۔ کنز العمال:۳/۱۳۴
۵۔ الإکلیل فی استنباط التنزیل،للسیوطی،ص:۱۱
۶۔ کتاب المناقب للموفق:۲/۵۱
۷۔ خطبات بھاول پور، خطبہ:۳
۸۔ تهذیب الکمال ۲۴/۴۶۴
۹۔ أخرجه ابن عدی فی کتابه الکامل ،جلد:۸،ص:۲۳۸،الفقه و المتفقه بغدادی ۲/۴۷،مناقب ابی حنیفه ذهبی،ص:۲۱
۱۰۔ سیر الاحناف:۲۹
۱۱۔ النافع الکبیر:۱۶
۱۲۔ ازالة الخفاء جلد:۲،ص:۸۲
۱۳۔ قنوجی:الجنة فی الاسوة الحسنة بالسنة،ص:۶۸
۱۴۔ عراقی:تاریخ بغداد،جلد:۲،ص:۶۷،المزی جمال الدین، تهذیب الکمال ،جلد:۹،ص:۲۸
۱۵۔ تهذیب الکمال ۱۵/۲۲۴
۱۶۔ قنوجی.الجنة فی الاسوة الحسنة بالسنة ،ص:۶۸
۱۷۔ قنوجی.اتحاف النبلاء المتقین باحیاء ماثر الفقهاء،۲۳۷
۱۸ سیر أعلام النبلاء للذهبی
۱۹۔ مناحیٰ التشریع الإسلامی فی القرن الثانی الهجری، محمد بلتاجی،ص:۳۸۱
۲۰۔ شرح مؤطا للباجی مالکی ۷/۳۰۰،مفتاح السعادة:۲/۱۱۲
۲۱۔ تذکرة الحفاظ للذهبی:۱/۲۸۲
۲۲۔ الانتقاء فی فضائل الائمة الثلاثة الفقهاء.ابن عبد البر، یوسف بن عبد اللّٰه، ,:۲/۱۵۔ جامع بیان العلم:۲/۱۴۹،لابن عبدالبر(۴۶۳-۳۶۶)
۲۳۔ تذکرة الحفاظ:۲۸۲
۲۴۔ تذکرة الحفاظ۱/۲۸۲۔ تهذیب التهذیب۲/۴۵۰لابن حجر عسقلانی

۲۵۔ مقدمه نصب الرایه:۱/۴۲

۲۶۔ طبقات الشافعیه الکبریٰ ۱/۲، مطوبعہ مصر، تاج الدین السبکی

۲۷۔ (ابجد العلوم:۸۱۰) الحطة فی ذکر الصحاح الستة دار الکتب العلمیه بیروت ۱۹۸۵ء۳۴، ص:۲۸۰

۲۸۔ فیض الباری ۱/۵۸

۲۹۔ سوانح عمری محمد زکریا ص:۳۳۴

۳۰۔ الیانع الجنی، ص:۹۴ (کشف الظنون)۔(الانصاف)

۳۱۔ الحطة فی ذکر صحاح السته: ۲۴۰، (الحطہ ۱۲۵) بستان المحدثین۔(الانصاف)

۳۲۔ الحطة فی ذکر صحاح السته: ۲۵۴

۳۳۔ طبقات الشافعیه:۱/۲۳۲

۳۴۔ فیض الباری ۱/۵۸

۳۵۔ حوالہ سابق:۲/۳۱۰

۳۶۔ تدریب الراوی:۱/۱۷۴

۳۷۔ الرسالة المستطرفه:۱/۱۳

۳۸۔ الانصاف، مقدمہ الکوکب الدری، ص:۱۵

۳۹۔ تذکرة الحفاظ ۲/۳

۴۰۔ البدایة والنهایة، ۱۰/۱۱۰

۴۱۔ نصب الرایة:۱/۴۰۸

۴۲۔ الذهبی فی میزان الاعتدال ۶/۱۰۷

۴۳۔ سیر اعلام النبلاء، ۱۳۶۹

۴۴۔ سیر اعلام النبلاء

۴۵۔ ایضاً

۴۶۔ طبقات الفقهاء ۱/۱۱۲، ۱۹۰، طبقات الشافعیة ۲

۴۷۔ تذکرة الحفاظ ۳/۲۸۸

۴۸۔ تذکرة الحفاظ ۲/۱۱۶

۴۹۔ تذکرة الحفاظ ۲/۱۸۵

۵۰۔ نقش دوام، ۴۴۱

مغیث احمد *

آبروئے شیراز سعدی شیرازی

سرزمین شیراز جسے دنیا دارالعلم کے نام سے جانتی ہے، ایران کے مشہور شہروں میں سے ایک ہے۔ شیراز کا مطلب ہے 'شیر کا پیٹ'۔ کسی زمانے میں یہاں پر دنیا کی ہر چیز درآمد کی جاتی تھی، مگر کوئی چیز برآمد نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے اس شہر کا نام شیراز پڑ گیا۔ اس شہر کو محمد بن قاسم بن ابوعقیل نے بسایا تھا۔ شیراز شروع سے ہی علم وادب اور تہذیب وثقافت کا مرکز رہا ہے۔ اگر چہ اب ماضی جیسی شان وشوکت اور جاہ وجلال باقی نہیں، مگر پھر بھی یہ شہر ایران کے تین بڑے شہروں میں سے ایک ہے۔ یہاں کے لوگ روایتی رکھ رکھاؤ والے ہوتے ہیں، یہاں ابھی بھی لوگ کویں سے پانی پیتے ہیں۔ یہ شہر بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں پر تابعین کی ایک بڑی تعداد مدفون ہے۔ یہاں بڑے بڑے علما، ادبا، شعرا، سائنسداں، دانشور، ماہر تعلیم، صوفی اور فلسفی پیدا ہوئے، جنھوں نے نہ صرف اس شہر کا نام روشن کیا بلکہ اپنی مثبت اور تعمیری فکر کے سبب پوری دنیا کے لیے مرجع خلائق ثابت ہوئے۔ نامور محدث حسن بن عثمان شیرازی، مشہور زاہد محمد خفیف شیرازی، حافظ حدیث احمد بن عبدالرحمٰن شیرازی، معروف محدث احمد بن منصور

* اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی (یوپی) ای میل:moghees.ahmad5@gmail.com

شیرازی، عارف باللہ سید قطب الدین محمد الحسنی شیرازی، مشہور نحوی عمرو بن عثمان معروف بہ سیبویہ، مشہور نحوی حسن بن احمد شیرازی، ماہر نجوم ابوالحسن بن محمد شیرازی، ماہر علوم تفسیر وحدیث محسن بن خطیر جیسے درجنوں مشاہیر اسی سرزمین شیراز کی آغوش میں آرام فرما رہے ہیں۔ انھیں عظیم ہستیوں میں سے ایک معتبر نام شیخ سعدی شیرازی کا ہے۔ زیر نظر مضمون سعدی شیرازی کے علمی وادبی کارناموں سے متعلق ہے۔

شیخ سعدی آج سے آٹھ صدی قبل ایران کے اسی شہر شیراز میں پیدا ہوئے، یہیں پلے، بڑھے اور پروان چڑھے اور پھر یہیں پر انتقال فرما کر اسے ہمیشہ کے لیے اپنی آرامگاہ بنالیا۔ سعدی کی ابتدائی تعلیم شیراز میں ہوئی، اعلیٰ تعلیم کے لیے مدرسہ نظامیہ بغداد گئے، بغداد اس زمانے میں سلطنت عباسیہ کا دارالحکومت بھی تھا، جہاں سے انھوں نے سائنس، قانون، حکمت وفلسفہ، تاریخ، اسلامیات اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد سیر وسیاحت پر نکل پڑے اور شام، مصر، عراق، اناطولیا، سعودی عرب سمیت کئی ملکوں کا سفر کیا۔ ایک روایت کے مطابق دہلی اور گجرات کا بھی دورہ کیا اور کئی بار پیدل حج کرنے کی سعادت حاصل کی۔ صلیبی جنگوں میں شریک ہوئے اور جنگی قیدی بن کر سات برسوں تک زندان کی صعوبتیں برداشت کیں۔ شیخ سعدی ایک جید عالم دین، پیر طریقت صوفی، نامور سیاح، مصلح، مفکر اور معروف شاعر وادیب کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ سعدی کا سراپا کھینچتے ہوئے حالی لکھتے ہیں:

> ''شیخ ایک نہایت صحیح المزاج، قوی اور جفاکش آدمی تھا، اس کے قوہ کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے دس بارہ حج پیادہ پا کیے تھے اور اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ صحرانوردی اور بادیہ پیمائی میں بسر کیا اور ایک سو بیس برس کے قریب عمر پائی.....اس کو تذکرہ نویسوں نے اہل باطن اور صوفیا میں شمار کیا ہے۔ اس کے کلام سے بھی جابجا یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ اس رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بیشک وہ صوفی بھی تھا اور واعظ بھی تھا، مگر آج کل کے مشائخ اور واعظین کے برخلاف ایک نہایت بے تکلف، کھلا ڈلا، یار باش، ظریف، ریا اور نمائش سے دور، سیدھا سادا مسلمان تھا۔ اس کو آج کل کے حضرات کی طرح اپنے تئیں لوازم بشریت سے بالکل پاک ظاہر کرنا اور بہ تکلف مقدس فرشتوں کی صورت میں جلوہ گر ہونا، ہرگز نہ آتا تھا۔ وہ شاعری

میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا، مگر مشرق کے عام شعرا کی طرح حریص اور لالچی نہ تھا۔ اس نے مثل ظہیر، رشید، خاقانی اور انوری وغیرہ کے بادشاہوں کی مداحی اور امیروں کی بھٹئی کرنے کو اپنی وجہ معاش نہیں بنایا تھا۔''[۱]

سعدی کے بارے میں مشہور ہے کہ انھوں نے ۳۰ برس حصول علم کے لیے کتابوں کا مطالعہ کیا اور جب کتابوں سے طبیعت بھر گئی تو ۳۰ برس کے لیے قدرت کے مناظر کا مشاہدہ کرنے نکل پڑے اور جب سیر و سیاحت سے طبیعت سیر ہوگئی تو ۳۰ برس تصنیف و تالیف میں گزار دیے اور آخر کے ۳۰ برس گوشہ نشینی میں بسر کی۔ شیخ سعدی ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جن کی صلاحیت کا ڈنکا ان کی زندگی میں ہی بجنے لگا تھا اور ہر شاہ و گدا ان سے ملاقات کا متمنی اور ان کی ایک جھلک پانے کو بیتاب رہتا تھا۔ حالی لکھتے ہیں:

''اسی طرح ملتان سے جو کہ شیراز سے چودہ سو میل ہے، دو بار خان شہید سلطان محمد قاآن نے شیخ کی شہرت سن کر اس کو وطن سے بلایا، مگر وہ بڑھاپے کے سبب نہ آ سکا۔''[۲]

نام: دنیائے فارسی میں شیخ سعدی کا نام جتنا عام ہے اس سے کہیں زیادہ ان کے اصل نام کے بارے میں تجسس رہا ہے۔ مختلف تذکرہ نگاروں نے ان کا مختلف نام بتایا ہے۔ معروف محقق محمد علی فروغی اور استاد عبدالعظیم قریب کی مشترکہ کوششوں سے چاپ شدہ کلیات سعدی میں ان کا نام 'شیخ ابوعبداللہ مشرف بن مصلح شیرازی' مرقوم ہے۔

''صنادید عجم'' کے مصنف نے 'شیخ شرف الدین بن مصلح الدین عبداللہ' لکھا ہے۔[۳] حالی نے بھی ان کا نام 'شرف الدین' لکھا ہے۔ حالی اور شبلی نے متفقہ طور پر ان کا لقب 'مصلح الدین' اور تخلص 'سعدی' لکھا ہے۔[۴] ''گلستان'' و ''بوستان'' کی بیشتر شروحات میں سعدی کا نام 'شرف الدین'، لقب 'مصلح الدین' اور تخلص 'سعدی' مرقوم ہے، قاضی سجاد حسین نے بھی ان کا نام 'شرف الدین'، لقب 'مصلح' اور تخلص 'سعدی' ہی لکھا ہے۔ البتہ رضازادہ شفق نے ان کا نام 'مشرف الدین مصلح بن عبداللہ سعدی شیرازی' لکھا ہے۔[۵]

انڈیا آفس کا ایک قدیم ترین نسخہ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سعدی کے انتقال کے

محض ۳۶ سال بعد ہی لکھ دیا گیا تھا، اس نسخہ میں سعدی کا نام 'مشرف الدین بن مصلح الدین' مرقوم ہے، ای جی براؤن اور دائرۃ المعارف الاسلامیہ نے 'انڈیا آفس' کے اسی نسخے کا حوالہ دیتے ہوئے، سعدی کا نام 'شیخ مشرف الدین بن مصلح الدین' لکھا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شبلی نے بھی اس نسخے کا ذکر کیا ہے مگر وہ 'مصلح الدین' سعدی کے والد کا نام نہیں، بلکہ خود سعدی کا لقب قرار دیتے ہیں۔ اس نسخے کا ذکر ''صنادید عجم'' میں بھی موجود ہے۔[۶]

عربی ادب کے معروف مؤرخ ڈاکٹر عمر فروخ نے سعدی کا نام 'شیخ مشرف الدین بن مصلح الدین' لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''— هو الشيخ مشرف الدين بن مصلح الدين عبدالله الشيرازی، ولد فی مدينة شيراز (ايران) سنة ٦٠٦ھ (١٢٠٩-١٢١٠م) فی الارجح و فيها نشا. و كان مصلح الدين فی خدمة سعد الاول ابن زنكی السلغری الذی كان اتابكا علی فارس (٥٩٩-٦٢٨ھ) فاتخذ مشرف الدين لقبا من اسم سعد بن زنكی و عرف فی التاريخ باسم 'سعدی' او سعدی الشيرازی— انتقل سعدی فی مطلع شبابه الی بغداد و دخل المدرسة النظاميه ليتلقی فيها العلم. و يبدو ان ميله كان، فی مطلع حياته، الی الفقه و التصوف فحضر دروس الشهاب السهروردی (ت٦٣٢ھ) و سبط ابن الجوزی (ت٦٥٤ھ) و غيرهما من رجال التصوف خاصة —''[۷]

سعدی — وجہ تسمیہ

سعدی کو سعدی کیوں کہتے ہیں؟ اس تعلق سے تذکرہ نگاروں کے مختلف اقوال ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چونکہ سعدی کے والد اتابک فارس سعد بن زنگی کے دربار سے وابستہ تھے، ان کی وفات کے بعد سعد بن زنگی نے سعدی کی تربیت کا ذمہ اپنے سر لے لیا، اسی مناسبت سے انھوں نے اپنا تخلص 'سعدی'

رکھ لیا۔ بعض سوانح نگاروں نے یہ بھی لکھا ہے کہ چونکہ وہ صحابی رسولؐ حضرت سعد بن عبادہؓ کی اولاد سے منسوب تھے، اس لیے اپنے آپ کو 'سعدی' لکھا کرتے تھے، پروفیسر سید محیط طباطبائی نے ماہنامہ وحید تہران میں شیخ سعدی کو حضرت سعد بن عبادہ کی اولاد سے ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ لیکن حالی نے لکھا ہے کہ ایام طفولیت میں والد کا انتقال ہوگیا جس کے بعد تعلیم و تربیت کا بیڑا سعد بن زنگی نے اٹھایا، اسی مناسبت سے سعدی نے اپنا تخلص 'سعدی' رکھ لیا تھا۔ حالی لکھتے ہیں:

''شیخ کی ولادت کے کئی برس بعد اتابک سعد زنگی اپنے بھائی تکلہ بن زنگی کی جگہ تخت شیراز پر متمکن ہوا تھا، چونکہ شیخ نے سعد زنگی کے عہد میں شعر کہنا شروع کیا تھا اور نیز شیخ کا باپ عبداللہ شیرازی، سعد کے ہاں کسی خدمت پر مامور تھا، اس لیے اس نے اپنا تخلص سعدی قرار دیا۔''[۸]

علامہ شبلی ''تذکرہ دولت شاہی طبقہ چہارم'' کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مصلح الدین لقب اور سعدی تخلص تھا، ان کے والد اتابک سعد بن زنگی بادشاہ شیراز کے ملازم تھے، اس تعلق سے شیخ نے سعدی تخلص اختیار کیا۔''[۹]

مہدی حسین ناصری لکھتے ہیں:

''ان کے والد اتابک سعد بن زنگی والی شیراز (۱۱۹۵ء تا ۱۳۲۶ء) کے ملازم تھے، اس وجہ سے سعدی تخلص اختیار کیا۔''[۱۰]

ولادت: کسی شخصیت کے سال پیدائش یا وفات میں دو چار سال کی کمی یا بیشی عام سی بات ہوتی ہے اور عموماً اس پر بحث کرنا بے معنی سمجھا جاتا ہے، مگر کبھی کبھی اس کا تعین نہ کرنے پر یا تو بہت سے مفروضے قائم ہوجاتے ہیں یا پھر بہت سے حقائق کی تردید ہونے لگتی ہے، ایسے میں سال ولادت و وفات کے مسئلہ کو حتمی یا حقائق سے قریب تر کرنا ناگزیر ہوجاتا ہے، سعدی کے سال ولادت و وفات کا مسئلہ بھی کچھ اسی نوعیت کا ہے۔ سعدی کے نام کی طرح ان کے سال پیدائش اور وفات میں بھی خاصا اختلاف ہے۔ ''اے لٹریری ہسٹری آف پرشیا'' اور ''دائرۃ المعارف الاسلامیہ'' میں ۵۸۰ ہجری مطابق ۱۱۸۴ عیسوی مرقوم ہے۔ ای جی براؤن لکھتے ہیں:

"The poet's full name appears, from the oldest

known manuscript of his works (No. 876 of the India Office, transcribed in A.D. 1328, only thirty-seven years after his death) to have been, not, as generally stated, Muslihu'd-Din, but Musharrifu'd-Din b. Muslihu'd-Din 'Abdu'llah. He is generally said to have been born at Shiraz about A.D. 1184, and to have died more than a centenarian in A.D. 1291."[۱۱]

جبکہ حالی نے سر گوراوسلی (Sir Gore Ouseley) کا حوالہ دیتے ہوئے سعدی کا سال پیدائش ۵۸۹ ہجری لکھنے کے بعد کہتے ہیں— ''مگر تحقیق یہ ہے کہ وہ سال مذکور سے بہت برسوں پہلے اتابک مظفرالدین تکلہ بن زنگی کے عہد حکومت میں پیدا ہوا ہے۔ شیخ کی ولادت کے کئی برس بعد اتابک سعد زنگی اپنے بھائی تکلہ بن زنگی کی جگہ تخت شیراز پر متمکن ہوا تھا۔''[۱۲]

حالی یہ باتیں لکھنے کے بعد حاشیہ میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس کی ولادت کا سال کسی نے نہیں لکھا۔ صرف سال وفات سب نے لکھا ہے، یعنی سنہ ۶۹۱ ہجری اور عمر ۱۰۲ یا ۱۱۰ یا ۱۲۰ برس کی بتائی ہے۔ پس کم سے کم عمر ماننے سے اس کی ولادت ۵۸۹ ہجری قرار پاتی ہے، لیکن اس سے لازم آتا ہے کہ ابوالفرج ابن جوزی جو بغداد میں اس کا جلیل القدر استاذ تھا، اس کی وفات کے وقت جو کہ قطعاً سنہ ۵۹۷ ہجری میں ہوئی ہے، شیخ کی عمر نو برس سے زیادہ نہ ہو، اور یہ بالکل خلاف واقع ہے۔ اس لیے اس کی عمر ۱۰۲ برس سے زیادہ تسلیم کرنی چاہیے۔''[۱۳]

علامہ شبلی سال پیدائش ۵۸۹ ہجری نقل کرنے کے بعد اس کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بعض تذکروں میں شیخ کی عمر ۱۲۰ برس لکھی ہے، اگر یہ خارج از قیاس عمر تسلیم کر لی جائے تو اور واقعات کی کڑیاں مل جائیں گی لیکن ایک سخت دقت پھر بھی باقی رہتی ہے، وہ یہ کہ شیخ نے گلستان میں لکھا ہے کہ جس زمانہ میں

سلطان محمود خوارزمشاہ نے خطا سے صلح کی، میں کاشغر میں آیا۔''[۱۴]

علامہ شبلی کے مطابق سلطان محمود کا انتقال ۵۸۹ھ میں ہوا، جس وقت ان کی عمر ۸ برس کی رہی ہوگی، مگر قراین سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ سعدی کی شاعری کی شہرت کم از کم ۳۰ یا ۴۰ برس کی عمر میں ہوئی، ممکن ہے کہ سعدی نے سہواً علاء الدین تکش خوارزمشاہ کی جگہ محمود خوارزمشاہ کا نام لکھ دیا ہو۔

''صنادید عجم'' میں بھی سال پیدائش ۵۸۹ ہجری مرقوم ہے۔ تذکرہ دولت شاہ کے مطابق سعدی نے تیس برس طالب علمی میں گزارا، تیس برس سیر و سیاحت کی اور اس دوران انھوں نے دس بارہ بار پیدل حج کیا اور شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید ہوئے، ہندوستان، شام اور بلقان ہوتے ہوئے بلاد روم پہنچے، جہاں مولانا رومی سے شرف ملاقات حاصل کی اور پھر تیس برس عبادت و ریاضت میں بسر کی۔

شیخ سعدی اپنی کتاب ''بوستان'' میں جو ۶۵۵ ہجری میں تصنیف ہوئی، ایک جگہ لکھتے ہیں:

الا ای کہ عمرت بہ ہفتاد رفت
مگر خفتہ بودی کہ برباد رفت

سعدی نے اگر یہاں 'ہفتاد' کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ سعدی اس وقت یقینی طور پر ستر سال ہی کے رہے ہوں گے، ممکن ہے بہتر یا چوہتر سال کے ہو چکے ہوں، ممکن ہے 'ہفتاد' کا لفظ لمبی عمر کے اظہار کے لیے استعمال کیا گیا ہو اور ضرورت شعری کی وجہ سے یقینی عمر کا اظہار نہ کیا گیا ہو۔ جیسا کہ بعض تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی پیدائش ۵۸۰ ہجری میں ہوئی تھی اور یہی قول دائرۃ المعارف الاسلامیہ میں بھی منقول ہے۔ سعدی کے سال پیدائش ۵۸۰ ہجری تسلیم کرنے سے ابوالفرج ابن الجوزی سے سعدی کی ملاقات اور ان کی شاگردی اختیار کرنے کی بات کی بھی تائید ہو جاتی ہے۔

بہرحال مذکورہ بالا شعر کے مطابق سعدی کا سنہ ولادت ۵۸۵ ہجری قرار پاتا ہے۔ جو شبلی و حالی کے قول کے قریب تر ہے، جبکہ ''دائرۃ المعارف الاسلامیہ'' میں سعدی کا سال پیدائش ۵۸۰ ہجری نقل ہے، لیکن جیسا کہ ذکر ہوا ڈاکٹر عمر فروخ نے سعدی کا سال پیدائش ۶۰۶ ہجری لکھا ہے، ڈاکٹر رضا زادہ شفق کے مطابق بھی ۶۰۶ ہجری ہی ہے۔ اس تعلق سے ڈاکٹر محمد ریاض لکھتے ہیں:

''ولادت بہرحال ساتویں صدی ہجری یا تیرہویں صدی عیسوی کے ابتدائی سالوں میں ہوئی اور وفات ۶۹۰ تا ۶۹۵ ہجری یا ۱۲۹۱ تا ۱۲۹۶ کے

کسی سال میں۔''[۱۵]

شیخ سعدی ''گلستان'' میں جو ۶۵۶ ہجری میں تصنیف ہوئی، ایک جگہ رقمطراز ہیں:

ای کہ پنجاہ رفت و در خوابی
مگر این پنج روزہ در یابی

سعدی کے اس شعر کے مطابق سنہ ولادت ۶۰۶ ہجری بنتا ہے، جس سے ڈاکٹر عمر فروخ اور ڈاکٹر رضازادہ شفق کے قول کی تائید ہوتی ہے۔

وفات: تذکرہ کی زیادہ تر کتابوں میں سعدی کا سنہ وفات ۶۹۱ھ مرقوم ہے، ''صنادید عجم''، ''شعرالعجم''، ''حیات سعدی'' میں یہی قول منقول ہے، البتہ ڈاکٹر رضازادہ شفق نے ۶۹۱ھ اور ۶۹۴ھ دونوں ذکر کیا ہے، جب کہ پروفیسر علی اصغر حکمت نے ۶۹۵ھ لکھا ہے۔ بہرحال سعدی کا سال پیدائش ۵۸۰ھ اور وفات ۶۹۵ھ مان لیں تو سعدی کی عمر ۱۱۵ ہوجاتی ہے اور اس سے اس واقعہ کی بھی تائید ہوجاتی ہے کہ سعدی کی عمر ۱۱۰ سے ۱۲۰ سال کے درمیان رہی ہے۔ ظاہر ہے عمر کا اختلاف تاریخ پیدائش و وفات کے اختلاف سے ہی پیدا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سعدی کی عمر کے بارے میں متعدد اقوال ہیں۔ کسی نے سعدی کی عمر ۹۰ سال تو کسی نے ۱۰۲ جب کہ کچھ تذکرہ نگاروں نے ۱۰۰ سے ۱۲۰ سال لکھ کر تحقیق کی ساری ذمہ داری قارئین کے سر تھوپ دیا۔

تعلیم: سعدی نے ابتدائی تعلیم شیراز میں حاصل کی، پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے بغداد کا رخ کیا اور مدرسہ نظامیہ میں داخل ہوگئے، جہاں علامہ ابن الجوزی جیسے جید علما سے زانوئے تلمذ تہہ کیا، شیخ شہاب الدین سہروردی کی صحبت سے فیضیاب ہوئے اور ان کے دست مبارک پر بیعت کی، تقریباً بارہ بار پیدل حج کیا، بیت المقدس میں برسوں سقائی کی خدمت انجام دی، بزرگان دین اور اہل معرفت سے نیازمندی کے لیے روم کا سفر کیا، طرابلس میں صلیبیوں کے ستم جھیلے اور ایک عرصہ تک عیسائی قیدیوں کے ساتھ خندق کھودنے پر مجبور ہوئے۔ ۱۲۲۶ء میں سعد بن زنگی کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا اتابک ابوبکر بن سعد بن زندگی مسند نشیں ہوا اور ملکی نظام میں بہتری آئی تو سعدی دوبارہ شیراز واپس آگئے اور اس کی شان میں کئی مدحیہ قصیدے لکھے۔

تیرہویں صدی عیسوی کے اواخر میں سلطان غیاث الدین بلبن کا لائق ترین شہزادہ سلطان محمد

خان شہید جوادب شناس اور علم دوست انسان تھا اور اس زمانے میں ملتان کا حاکم بھی تھا، اس نے اپنے والد کی طرف سے تحفہ تحائف اور اخراجات سفر بھیج کر سعدی کو تقریباً دو مرتبہ ہندوستان آنے کی دعوت دی، لیکن انھوں نے اپنی ضعیفی کا حوالہ دے کر معذرت کر دی اور اپنے اشعار لکھ کر خان شہید کی خدمت میں بطور ہدیہ بھیجا اور طوطیٔ ہند امیر خسرو کی تعریف کرتے ہوئے کہ 'یہ جوہر قابل، قدر دانی کے قابل ہے'۔ کہہ کر ان کی عزت افزائی اور سفارش کی۔

۶۶۷ھ میں اتابک خاندان کے خاتمہ کے بعد تاتاریوں کا فرماں روا ہلاکو کے لڑکے اباقا خان نے انقیانو کو شیراز کا حاکم مقرر کیا، اس وقت بغداد میں تاتاریوں کی جانب سے خواجہ شمس الدین جوینی کے بھائی علاء الدین جوینی حکمراں تھے۔ دونوں بھائیوں کی شیخ سعدی سے گہری وابستگی تھی، دونوں انھیں اپنا مرشد و مصلح اور پیر طریقت سمجھتے تھے۔ خواجہ شمس الدین کی کاوشوں سے ہی تاتاریوں کو اسلام کی دولت نصیب ہوسکی تھی اور علاء الدین جوینی جو مشہور مورخ اور ''تاریخ جہاں گشای'' کا مصنف ہے۔ ان دونوں بھائیوں نے شیخ سعدی کی قدر و منزلت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

سیاحت: سعدی نے ایک طویل عمر پائی اور اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ سیاحت میں گزارا، سرگور اوسلی کے مطابق مشرقی سیاحوں میں سے ابن بطوطہ کے بعد سب سے لمبی مسافت سر کرنے والوں میں دوسرا نام سعدی کا ہی آتا ہے۔ چنانچہ سعدی نے ایشائے کوچک، بلخ، بربر، غزنیں، حجاز، عرب، شام، بعلبک، مصر، فلسطین، آرمینیا، بغداد، ایران کے جملہ ممالک، توران کے اکثر ممالک، رودبار، دیلم، کاشغر اور جیحون سے بھی آگے تک اور بصرہ و کوفہ سے سد سکندری تک کے علاقوں کا دورہ کیا۔ محققین کے مطابق سعدی نے ہندوستان کا بھی سفر کیا جس کی ابھی تک توثیق نہیں ہوسکی ہے، لیکن اس کی تردید کے لیے بھی کوئی واضح ثبوت نہیں ہے۔ دوران سفر سعدی نے ہر طرح کے لوگوں سے ملاقات کی، انھیں سمجھنے اور برتنے کی کوشش کی اور ان کے طرز معاشرت سے مختلف طرح کے تجربات حاصل کیے۔ کئی ملکوں اور شہروں کی سیاحت کے بعد ۱۲۵۶ میں وہ دوبارہ شیراز واپس آئے اور پھر آخر عمر تک یہیں رہے، ہلاکو کے پوتے ارغون خان کے عہد حکومت میں انتقال فرمایا اور مقام 'دلکشا' کے قریب پہاڑی کے دامن میں سعدی کی آخری آرامگاہ ہے، جو 'سعدیہ' کے نام سے مشہور ہے، یہ مقبرہ شیراز شہر کے باہر مشرقی جانب میں ہے، پہلوی عہد میں اس کا تعمیر نو بھی ہوا تھا۔ سعدی کا مزار حافظ کے مزار سے تھوڑے ہی فاصلہ پر واقع ہے۔

تصوف: سعدی علم تصوف کے اسرار ورموز سے بخوبی واقف تھے،انھوں نے تصوف کے چشم سے زندگی کو دیکھنے اور دکھانے کی سعی کی ہے۔وہ ہر معاملے میں اعتدال پسندی کو ترجیح دیتے ہیں۔شہاب الدین سہروردی سے سعدی کا رشتہ پیرومرشد کا رہا، شیخ شہاب الدین سہروردی نے انھیں دو نصیحتیں کی تھیں۔ایک یہ کہ خود پرستی نہ کرنا اور دوسرے یہ کہ اپنی ذات سے برا کسی کو نہ سمجھنا۔علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''شیخ نے تصوف وسلوک کی تعلیم شیخ شہاب الدین سہروردی المتوفی ۶۳۰ ہجری سے حاصل کی،اسی سیاحت کی بدولت سفر دریا میں ان کا ساتھ ہوا اور ان کی فیض صحبت سے شیخ نے تزکیہ نفس کے مراتب طے کیے، چنانچہ خود فرماتے ہیں:

مرا پیر دانائے فرخ شہاب
دو اندر ز فرمود بر روئے آب
یکی آنکہ بر خویش خود بین مباش
دگر آنکہ بر غیر بد بین مباش''[۱۶]

افلاکی نے مولانا جلال الدین رومی سے بھی سعدی کی ملاقات کی بات کہی ہے۔بہرصورت سعدی کی عبادت وریاضت اور پاکبازی کی تصدیق تقریباً سبھی تذکروں نگاروں نے کی ہے۔علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''شیخ کا شمار صوفیا کبار میں ہے اور بے شبہ وہ پاکیزہ باطن اور صاحب حال تھے لیکن ان کی مخصوص حالت یہ ہے کہ وہ اس رتبہ پر مجاہدہ اور ریاضت کے بعد پہنچے تھے، ان کی اصلی سرشت یہ نہ تھی، بچپن سے شباب بلکہ ادھیڑ پن کے زمانہ تک ان میں وہ اوصاف نظر آتے ہیں جو مولویوں کا خاصہ ہیں، یعنی خود بینی، حرف گیری، مشاجرت ومخاصمت، باپ کی صحبت کے اثر سے بچپن میں عبادت کا ذوق وشوق پیدا ہوگیا ہے، شب بیداری اور ورد و وظائف میں مصروف ہیں لیکن ساتھ ہی اوروں پر حرف گیری کرتے جاتے ہیں کہ دیکھئے کسی کو نماز پڑھنے کی توفیق نہیں ہوتی۔

نظامیہ میں حدیث پڑھتے ہیں، کسی نے ان کے خلاف کچھ کہہ دیا ہے، اس پر آپے سے باہر ہوجاتے ہیں اور کہتے ہیں:

چومن داد معنی دہم در حدیث
برآید بہم اندرون خبیث

ایک درویش سے دولت مندی اور درویشی کے متعلق بحث کرتے کرتے دست و گریباں ہوجاتے ہیں اور دھول دھپے تک نوبت پہنچادیتے ہیں۔

دشنامم داد سقطش گفتم
گریبانم درید زنخدانش شکستم

حج کا سفر ہے، ذوق وشوق میں احرام باندھے پاپیادہ جارہے ہیں، اس حالت میں بھی زبان سے ناسزا کلمات نکل رہے ہیں، چنانچہ خود فرماتے ہیں:

درسروردی ہمدیگر فتادیم وداد فسق وجدال دادیم

حسن پرستی امرد پرستی تک پہنچ گئی ہے اور ایسے کھیل کھیلتے ہیں کہ اس کا ذکر تک نہیں کیا جاسکتا۔

بے شبہہ یہ باتیں ان کے عارض کمال کے داغ ہیں لیکن ایک رفارمر (Reformer) اور مصلح کے لیے ان تمام مراحل سے گزرنا ضرور تھا۔''[۱۷]

ایک معلم اخلاق ہونے کی حیثیت سے سعدی نے اپنی زندگی کے سرد وگرم پہلوؤں سے خوشہ چینی کی ہے۔ زندگی کے اخلاقی پہلوؤں کو اتنے موثر انداز میں پیش کیا ہے کہ دل سے نکلی ہوئی باتیں راست طور پر دل میں جاگزیں ہوجاتی ہیں۔ انھوں نے اخلاقیات کو ادب کے جام میں پیش کرنے کا ہنر سکھایا ہے، ان کے شہ پاروں سے انسانیت اور انسان دوستی کا درس ملتا ہے۔ وہ ایسے صاحب بصیرت ہیں جو دنیا سے دوری اپنائے بغیر اس کی فنا پذیری کی حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہیں اور مناظر قدرت کو دیکھ کر طرب میں نہیں آتے، بلکہ سجدۂ شکر ادا کرتے ہیں۔ دکتر بدیع اللہ دیبری نژاد لکھتے ہیں:

''تصوف درنظر سعدی صفای باطن وجمعیت خاطر و پاکی اخلاق است''[۱۸]

سعدی مشاہیر کی نظر میں: سعدی کی شخصیت اور ان کی علمی عبقریت کو ان کے ہم عصروں نے بھی مانا ہے اور بعد کے مشاہیر نے بھی تسلیم کیا ہے۔ مجد ہمگر جوا تابک ابوبکر بن سعد کے دربار سے وابستہ تھا، سعدی

کی سخن دانی کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ کہتا ہے:

از سعدی مشہور سخن شعر رواں جوی
کو کعبہ فضل است دلش چشمۂ زمزم

خواجہ ہمام الدین تبریزی کہتا ہے:

ہمام را سخن دلفریب و شیرین ہست
ولی چہ سود کہ بی چارہ نیست شیرازی

سعدی کی شعر گوئی کے بارے میں امیر خسرو ''قران السعدین'' میں لکھتے ہیں:

نوبت سعدی کہ مبادا کہن
شرم نداری کہ بگوئی سخن[۱۹]

''حضرت امیر خسرو دہلوی نے بھی شیخ سعدی اور ہمام تبریزی کو اپنی مثنوی 'نہ سپہر' میں غزل کا استاذ مانا ہے، لیکن دیگر اصناف سخن میں کنایۃً اپنے کو ترجیح دی ہے، مگر ایک اور شعر میں مطلقاً شیخ کے اتباع پر فخر کیا ہے، شعر:

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخ
شیرہ از میخانۂ مستی کہ در شیراز بود[۲۰]

امیر حسن دہلوی جنھیں 'سعدی ہند' بھی کہا جاتا ہے، سعدی کی پیروی پر اظہار افتخار کرتے ہوئے کہتے ہیں، شعر:

حسن گلی زگلستان سعدی آورد است
کہ اہل معنی گلچین ازین گلستان اند[۲۱]

سعدی کی استاذی کا ذکر کرتے ہوئے لسان الغیب حافظ شیرازی فرماتے ہیں:

استاذ سخن سعدیست نزد ہمہ کس اما
دارد سخن حافظ طرز سخن خواجو

سعدی کی علمی افضلیت کا اعتراف ہر زمانے میں ہوا، حالی نے ان میں سے کچھ کا نام اپنی کتاب میں بھی شامل کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''مولانا عبدالرحمان جامی نے 'بہارستان' میں کسی شاعر کا قطعہ نقل کیا ہے، جس میں فردوسی کو مثنوی کا، انوری کو قصیدے کا اور سعدی کو غزل کا پیمبر قرار دیا ہے اور وہ قطعہ یہ ہے، قطعہ:

در شعر سہ کس پیمبرانند
ہر چند کہ لا نبی بعد
ابیات و قصیدہ و غزل را
فردوسی و انوری و سعدی[۲۲]

چمبرز انسائکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ ''سعدی کے کلام کی لطافت اور بذلہ سنجی، روما کے مشہور شاعر ہوریس کے کلام سے بہت ملتی ہے، چونکہ سعدی کو لاطینی زبان آتی تھی، اس لیے ظن غالب ہے کہ وہ ہوریس کے کلام سے مستفید ہوا ہوگا۔''[۲۳]

آثار: سرگوراوسلی (Sir Gore Ouseley)؛ ولیم مارٹن کلارڈ اوسلی اور ڈاکٹر رالف اوسلی کے والد تھے، جنھوں نے انگریزی عہد کے ہندوستان میں لکھنو میں 'دلکشا کوٹھی' کے نام سے ایک عالیشان عمارت تعمیر کرائی تھی، بعد میں برطانیہ کی طرف سے ایران کے پہلے سفیر کے طور پر تہران بھیجے گئے، جہاں انھوں نے ایران اور روس کے مابین بہت سے خطوں کے تنازعات کو حل کرنے میں اہم کردار نبھایا۔ فتح علی شاہ قاچار کے زمانے میں 'معاہدہ گلستان' سرگوراوسلی کی ہی مرہون منت ہے۔ سرگور اوسلی نے شوقیہ طور پر عربی، فارسی اور سنسکرت زبانوں میں مہارت حاصل کی اور بہت سی کتابیں شائع کیں۔ ۱۸۴۲ء میں پبلی کیشن آف اورینٹل ٹیکسٹ کے صدر بنائے گئے اور انھوں نے سعدی کی گلستان اور اس کے ترجمہ میں خصوصی دلچسپی لی۔

ان کی دو اہم کتابیں ہیں، جن میں سے ایک "Biographical Notices of Persian Poets" ہے، جو ان کی وفات کے دو سال بعد شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں انھوں نے سعدی کی تقریباً 24 کتابوں کا ذکر کیا ہے جو اس طرح ہیں: گلستان، بوستان، رسالہ در تقریر دیباچہ، مجالس خمسہ، رسالہ صاحب دیوان، رسالہ عقل و عشق، نصیحت الملوک، شمس الدین تازی گو، رسالہ

انکیانو، قصاید العربی، قصاید الفارسی، کتاب مراثی، کتاب ملمعات، ترجیعات، الطیبات، بدایع، مقطعات، الخبیثات، ہزلیات، رباعیات، مفردات، خواتیم، غزلیات قدیم، کتاب صاحبیہ۔

سعدی کے انتقال کے تقریباً ۴۲ سال بعد شیخ علی بن احمد بن ابی بکر نے ان کے تصانیف کو یکجا کیا۔ سعدی کی کلیات میں ان کے عربی اور فارسی قصائد اور غزلیات کے علاوہ ان کی رباعیات اور دیگر اصناف بھی شامل ہیں۔ حالی رقم طراز ہیں:

> ''شیخ کا تمام کلام نظم، نثر، فارسی اور عربی جو اس وقت متداول ہے اور جس کو شیخ علی بن احمد ابن ابی بکر نے، شیخ کی وفات سے بیالیس برس بعد علی الترتیب جمع کیا ہے، حسبِ تفصیل ذیل ہے:
> ۱۔ نثر میں چند مختصر رسالے (جن میں سلوک اور تصوف کے مضامین اور مشائخ و عرفا کی حکایتیں اور ملوک و حکام کے لیے نصیحتیں لکھی ہیں) ۲۔ گلستان، ۳۔ بوستان، ۴۔ پندنامہ (جس کو عرف عام میں کریما کہتے ہیں)، ۵۔ قصائد فارسی (جن میں مرثیے، ملمعات، مثلثات اور ترجیعات بھی شامل ہیں)، ۶۔ قصائد عربیہ، ۷۔ غزلیات کا پہلا دیوان موسوم بہ طیبات ۸۔ دوسرا دیوان موسوم بہ بدائع، ۹۔ تیسرا دیوان موسوم بہ خواتیم، ۱۰۔ غزلیات قدیم جو غالباً عنفوان شباب کی لکھی ہوئی ہیں، ۱۱۔ مجموعۂ موسوم بہ صاحبیہ جس میں شیخ نے قطعات، مثنویات، رباعیات اور مفردات کو خواجہ شمس الدین صاحب دیوان کی فرمائش سے ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ ۱۲۔ مطائبات و ہزلیات۔''[۲۴]

سعدی کی کلیات کے ابھی تک کئی نسخے شائع ہو چکے ہیں، سب سے قدیم نسخہ انڈیا آفس میں موجود ہے، جس کے بارے میں علامہ شبلی فرماتے ہیں:

> ''کلیات شیخ کا قدیم ترین قلمی نسخہ کتب خانہ دیوان ہند India Office میں موجود ہے، جس کا نمبر ۱۱۱۷ ہے، تاریخ استنساخ اول رجب ۷۲۸ ہجری یعنی شیخ کی وفات کے قریب ۳۶ سال بعد کا ہے، کاتب کا نام

ابوبکر بن علی بن محمد ہے جس نے شیخ کے اصلی نسخہ سے نقل لی ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے منقول من خط الشیخ العارف السعدی۔''[۲۵]

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نسخے کا ذکر دونوں بزرگوں نے کیا ہے اور دونوں نے کاتب کا نام ابوبکر بن علی بن محمد ہی لکھا ہے۔ مگر حالی بیالیس سال لکھتے ہیں، جب کہ شبلی چھتیس سال لکھ رہے ہیں۔ بہرحال ۳۶ سال ہو یا ۴۲ سال، سعدی کی کلیات کا یہ سب سے قدیم ترین نسخہ مانا جاتا ہے۔ کلیات کے علاوہ جن کتابوں کی وجہ سے سعدی کو عالمی شہرت نصیب ہوئی وہ ''بوستان'' اور ''گلستان'' ہیں۔ سعدی کی بوستان اور گلستان بالترتیب ۱۲۵۷ء اور ۱۲۵۸ء میں لکھی گئی۔ قدیم نسخوں میں 'بوستان' کو سعدی نامہ بھی کہا گیا ہے۔ بوستان و گلستان کی مشترکہ خوبیوں اور کمیوں پر ناقدانہ تبصرہ کرتے ہوئے حالی لکھتے ہیں:

''جو ظرافت اس نے گلستان اور نیز بوستان میں برتی ہے، وہ اکثر نہایت سنجیدہ اور معقول ہے۔ البتہ کہیں کہیں اس کے قلم سے ایسے الفاظ بھی ٹپک پڑے ہیں جو قانون شرم و حیا سے کسی قدر متجاوز ہیں لیکن ایک ظریف طبع اور شوخ مزاج آدمی کا ایسے الفاظ سے بچنا اسی سوسائٹی میں ممکن ہے جس میں مرد اور عورت تقریبا تمام جلسوں میں شریک ہوتے ہیں اور جہاں مردوں کو عورتوں کی مجالست اور ان کے تعلیم یافتہ ہونے کے سبب ہمیشہ تحریر و تقریر میں زبان قابو میں رکھنی پڑتی ہے، ورنہ طبیعت کی شوخی ایک ایسی چیز ہے جو بغیر سخت مزاحمت کے کسی طرح رک نہیں سکتی۔''[۲۶]

شیخ سعدی کی بوستان و گلستان ابتدائے تصنیف سے آج تک مقبول خلائق رہی ہیں۔ یہ شیخ سعدی کی طویل زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہیں۔ یہ وہ کتابیں ہیں جنھیں خواص نے بھی خاص سمجھا اور عوام نے بھی آنکھوں سے لگایا۔ اس کے اندر بڑے مؤثر اور دلچسپ پیرائے میں پند و موعظت کی باتیں کہی گئی ہیں۔ بوستان اور گلستان کے بارے میں حالی فرماتے ہیں:

''ان دو کتابوں کو شیخ کے کلام کا خلاصہ اور لب لباب سمجھنا چاہیے۔ ظاہرا فارسی زبان میں کوئی کتاب ان سے زیادہ مقبول اور مطبوع خاص و عام نہیں ہوئی۔ ایران، ترکستان، تاتار، افغانستان اور ہندوستان میں ان دونوں

کتابوں کی تعلیم ساڑھے چھ سو برس سے برابر جاری ہے۔ بچپن میں ان کی تعلیم شروع ہوتی ہے اور بڑھاپے تک ان کے مطالعے کا شوق رہتا ہے۔ لاکھوں استاذوں نے انھیں پڑھایا اور کروڑوں شاگردوں نے انھیں پڑھا۔ ان کے بے شمار نسخے خوش نویسوں کے قلم سے لکھے گئے اور بے انتہا ایڈیشن لوہے اور پتھر پر چھاپے گئے۔ مشرق و مغرب کی اکثر زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے، مشائخ اور علما نے ان کی عزت کی، بادشاہوں نے ان کو سلطنت کا دستور العمل بنایا، منشیوں اور شاعروں نے ان کی فصاحت اور بلاغت کے آگے سر جھکایا اور ان کے تتبع سے عاجز رہنے کا اقرار کیا۔ ان کا نام جس طرح ایشیا میں مشہور ہے، اسی طرح یورپ میں بھی عزت سے لیا جاتا ہے۔''[۲۷]

بوستان و گلستان کی عبارت اتنی رچی بسی اور پختہ ہے کہ اس کی مثال پیش کرنا کارے دارد۔ دونوں کتابوں کے لفظی محاسن پر اظہار خیال کرتے ہوئے حالی رقمطراز ہیں:

''ان دونوں کتابوں میں یہ بات بھی تعجب انگیز ہے کہ باوجودے کہ صنائع لفظی و معنوی ان میں کثرت سے موجود ہیں اور تقریباً نصف گلستان کے فقرے مسجع اور مقفا ہیں، با این ہمہ وہ سادگی میں ضرب المثل ہیں اور جہاں نثر عاری کا ذکر آتا ہے، وہاں سب سے پہلے گلستان کی مثال دی جاتی ہے، فی الواقع یہ شیخ کے کمال انشا پردازی کی ایک بہت بڑی دلیل ہے۔''[۲۸]

بوستان سعدی: جیسا کہ ذکر ہوا بوستان کی سال تصنیف ۶۵۵ مطابق ۱۲۵۷ بتائی جاتی ہے، ذیل کے اشعار سے اس کا اشارہ ملتا ہے:

زششصد فزون بود پنجاہ و پنج
کہ من گفتم این نامبردار گنج

پھر اس کے ایک سال بعد انھوں نے 'گلستان' تصنیف کی، جیسا کہ اس کے مقدمہ کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے:

دران مدت کہ مارا وقت خوش بود
زہجرت شش صد و پنجاہ و شش بود

'بوستان' نظم میں ہے جب کہ 'گلستان' نثر ونظم کا آمیزہ ہے۔ دونوں کتابیں اخلاقی موضوعات پر ہیں جن میں اخلاقی مسائل کہانیوں کی زبان میں بڑے دلچسپ اور موثر انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ متن کو جابجا قرآنی آیات اور احادیث نبویؐ سے مزین کیا گیا ہے۔ معروف محقق ایتھے فارسی شاعری میں صوفیانہ، اخلاقی اور ناصحانہ رجحانات پیش کرنے میں اولیت کا سہرا سعدی کے سر ہی باندھتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ سعدی کی مقبولیت اور شہرت دراصل ان کے اسی اخلاقی عنصر کی مرہون منت ہے۔

بوستان میں بالخصوص روحانی بالیدگی پر زور دیا گیا ہے، شیخ سعدی مخلوق خدا سے احتراز اور گوشہ نشینی کے حامی نہیں، وہ ان علما و صوفیا کو خانقاہ میں بیٹھے صوفیا سے بہتر گردانتے ہیں جو بازاروں، محلوں اور عوام الناس میں رہ کر انھیں وعظ ونصیحت کرتے ہیں اور انھیں انسانی قدروں کے بارے میں بتاتے ہیں۔

سعدی کی 'بوستان' فارسی میں مثنوی نگاری کی ایک عظیم شاہکار ہے، اس میں کل دس ابواب ہیں، جس میں تقریباً چار ہزار اشعار ہیں، جو مثنوی کے قالب لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب ایک طویل تمہید کے بعد انصاف، مہربانی، محبت، عاجزی، اطمینان، یاد، تربیت، شکر، توبہ اور دعا جیسے اہم موضوعات کے ساتھ اختتام ہوئی ہے۔

بوستان وگلستان میں خود مصنف کی ذاتی زندگی کی بھی جھلک دکھائی دیتی ہے، بلکہ بعض محققین نے تو سعدی کے کلام کی روشنی میں ان کے احوال زندگی کا اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے۔ جیسے طرابلس میں قید وبند سے دوچار ہونا یا اپنے والد کے دوست کی لڑکی سے چند روز کی شادی اور جدائی، حبشہ اور مراکش کی سیر، یمن میں دوسری شادی، اتابک ابوبکر ابن سعد ابن زنگی سے روابط اور پھر اس کی موت پر مرثیہ لکھنا، سقوط بغداد پر ان کا عربی میں لکھا گیا مرثیہ، مغول فاتحین کا ذکر، انقیانو، عطا ملک جوینی اور شمس الدین جوینی کی شان میں لکھے گئے قصائد وغیرہ۔

گلستان سعدی: سعدی ''گلستان'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اپنی عمر کے بیتے ہوئے

لمحات کو یاد کر کے محاسبہ کر رہا تھا اور اپنی پچاس سالہ زندگی کے قیمتی اوقات ضائع ہونے پر اپنے آپ کو کوس رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس دنیا میں جو بھی آیا ایک نئی عمارت تعمیر کی اور وقت پورا ہونے پر مکان خالی کیا اور رخصت ہو گیا۔ بعد میں آنے والوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ کوئی بھی اپنے ساتھ اپنی جائیداد اور مکان لے کر نہیں گیا۔ الغرض یہ دنیا کسی کی نہیں، اس سے دوستی کرنا، ہوشمندی نہیں۔ ہماری زندگی عناصر اربعہ کے توازن پر قائم ہے جو کسی بھی لمحہ بگڑ سکتا ہے۔ یہاں کی نہ دوستی دائم ہے اور نہ ہی دشمنی قائم رہنے والی ہے۔ یہاں کی نہ خوشی میں ثبات ہے اور نہ ہی دل لگی میں دوام ہے۔ یہ دنیا دھوکہ اور چھلاوا ہے اور ہماری عمر برف کی مانند وقت کی تپش سے بڑی تیزی سے پگھل رہی ہے۔

ایسی زوال پذیر دنیا میں دولت وحشمت پر غرور کرنا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اب باقی کی زندگی گونگا اور بہرہ بن کر گوشۂ گمنامی میں گزار دوں تا کہ میری زبان سے کسی کو گزند نہ پہنچے اور نہ ہی میں کسی کی بات سے رنجیدہ ہو سکوں۔

ہر کہ آمد، عمارتی نو ساخت
رفت و منزل بہ دیگری پرداخت

سعدی کہتے ہیں کہ میں ابھی انہی سوچوں میں گم تھا کہ میری عمر بھی دن بہ دن گزرتی جا رہی ہے اور ابھی تک میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جسے دنیا یاد کر سکے کہ اچانک میرا ایک پرانا دوست میرے کمرے میں آ دھمکا اور ہنسی مذاق اور دل لگی کی باتیں کرنے لگا۔ میں نے اس کی شوخی بھری باتوں کا کوئی جواب نہ دیا۔ میرا دوست میری خاموشی پر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا، اتنے میں میرے ایک دوسرے دوست نے اسے سارا ماجرا سنا دیا کہ سعدی نے گوشۂ تنہائی اختیار کر لی ہے، بہتر ہے اب تو بھی گوشہ نشینی اختیار کر لے۔ یہ بات سن کر سعدی کے دوست نے بھی قسم کھالی کہ جب تک سعدی اپنی پرانی عادتوں پر لوٹ نہیں آتا، میں بھی یہاں سے ٹلنے والا نہیں۔ بقول سعدی:

اگر چہ پیش خرد مند خامشی ادب ست
بہ وقت مصلحت آن بہ کہ در سخن گفتن
دو چیز طرہ عقل ست دم فرو بستن
بہ وقت گفتن و گفتن بہ وقت خاموشی

'عقلمندوں کی نظر میں اگر چہ خاموش رہنا ادب ہے۔لیکن اگر کوئی مصلحت ہوتو بولنا بھی اچھا ہے۔خلاف عقل بات یہی ہے کہ بولنے کے وقت خاموش رہا جائے اور خاموش رہنے کے وقت بولا جائے۔'اب میرے پاس بولنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اور لامحالہ مجھے اپنے دوست سے باتیں کرنی پڑیں۔چنانچہ ہم لوگ سیر وتفریح کے لیے ایک باغ میں گئے جہاں گلاب کے پھول کھلے ہوئے تھے، انگور اپنی بیلوں میں لٹک رہے تھے، عجیب حسین منظر تھا، ہم لوگوں نے رات وہیں گزاری، صبح کو میرے دوست نے گلاب وسنبل وریحان کے کچھ پھول لے جانے کی خواہش ظاہر کی، تو میں نے کہا کہ تمہیں پتہ بھی ہے کہ ان پھولوں میں کوئی پائیداری نہیں، ان سے دل لگانا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔

بچہ کار آیدت ز گل طبقی
از گلستان من ببر ورقی
گل ہمین پنج روز و شش باشد
وین گلستان ہمیشہ خوش باشد

پھولوں کا یہ گلدستہ کس کام کا؟ میری گلستان سے ایک ورق لے جا، یہ گل پانچ چھ روز میں مرجھا جائیں گے، مگر میرا یہ چمن ہمیشہ شاداب رہے گا۔یہ سن کر دوست نے گلدستہ وہیں چھوڑ دیا اور میرے ساتھ ہولیا۔اتفاق سے ہم نے ''گلستان'' کے دوباب اسی دن مکمل کیے تھے۔جن میں سے ایک 'حسن معاشرت' اور دوسرا 'گفتگو کرنے کے آداب' سے متعلق تھا اور ابھی موسم بہار ختم بھی نہ ہوا تھا کہ میری ''گلستان'' پایہ تکمیل کو پہنچ گئی۔

سعدی نے نظم آمیز نثر ''گلستان'' جیسی عظیم شاہکار پیش کر کے فارسی نثر نویسی کی دنیا میں ایک ایسی چھاپ چھوڑی ہے، جسے دیکھ کر بڑے بڑے ادبا انگشت بدندان ہوگئے۔سعدی کی ''گلستان'' اس کی بہترین مثال ہے۔گلستان چھوٹی چھوٹی دلچسپ کہانیوں کا مجموعہ ہے، جس میں بہت دلچسپ انداز میں امثال وحکم اور حکایات کے ذریعہ باتوں کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔جابجا فارسی اور عربی کے اشعار، احادیث مبارکہ اور قرآنی آیات کے ذریعہ اپنے مدعا کو مستحکم اور موثر بنایا گیا ہے۔گلستان کے طرز نگارش اور اس کی ابواب بندی پر اظہار خیال کرتے ہوئے حالی لکھتے ہیں:

''گلستان کے ابواب کی عمدہ ترتیب، اس کے فقروں کی برجستگی، اس کے

الفاظ کی شستگی، اس کے استعارات کی جزالت، اس کی تمثیلات وتشبیہات کی طرفگی اور پھر باوجود ان تمام باتوں کے، عبارت میں نہایت سادگی اور صفائی، اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ شیخ نے اپنی عمر عزیز کا ایک معتدبہ حصہ اس کی تصنیف میں صرف کیا تھا اور اس کی تنقیح وتہذیب میں اپنے فکر اور سلیقے سے پورا پورا کام لیا تھا۔''[۲۹]

عقلی طور پر حالی کی باتیں بجا معلوم ہوتی ہیں، مگر ان کے اس جملے سے تذکرہ نگاروں کے اس قول کی تردید ہوتی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ بوستان وگلستان ایک سال کے فاصلے کے ساتھ یکے بعد دیگرے تصنیف کی گئی تھیں۔ حقائق پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ سیاح عموما دوران سفر ہی اپنی یادداشت رقم کرلیا کرتے ہیں اور پھر سفر کے اختتام پر اسے ترتیب دے کر کتابی شکل دے دیتے ہیں۔ ممکن ہے سعدی نے بھی ایسا ہی کیا ہو کہ پہلے سے لکھے گئے اوراق کو ایک ایک سال کے فاصلے سے بوستان وگلستان کی شکل دے دی ہو۔

گلستان کے اندر سعدی نے اس وقت کے فرمانرواؤں کی خامیوں کو مختلف واقعات اور ضرب الامثال کے ذریعہ بیان کر کے انتہائی لطیف پیرایہ میں سبق آموزی کی دعوت دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ایک بادشاہ کو اپنے دشمنوں سے سخت معرکہ آرائی کا سامنا ہوا، چنانچہ اس نے منت مانی کہ اگر وہ اس معرکہ کو سر کرلے گا تو ڈھیر سارا مال زاہدوں میں تقسیم کرے گا۔ جب اس کی مراد پوری ہوئی تو معرکہ سر کرنے کے بعد اس نے اپنے ایک غلام کو ڈھیر سارا مال دے کر شہر میں زاہدوں کو تقسیم کرانے کا حکم دیا، غلام تھیلی لے کر شہر کی جانب چل پڑا اور شام کو روپوں سے بھری تھیلی جوں کا توں واپس لیے بادشاہ سے عرض کیا کہ حضور! میں دن بھر مال دینے کے لیے زاہدوں کو تلاش کرتا رہا مگر کوئی زاہد ملا ہی نہیں۔ بادشاہ نے کہا کہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ میرے علم میں اس شہر میں ۴۰۰ سے زائد زاہد موجود ہیں۔ غلام کافی عقلمند تھا، اس نے جواب دیا: 'حضور! جو زاہد ہیں وہ لیتے نہیں اور جو لیتے ہیں وہ زاہد نہیں۔ بادشاہ اس کی باتیں سن کر ہنستے ہوئے بولا: جتنی مجھے زاہدوں سے انسیت ہے اسی قدر اس شخص کو زاہدوں سے نفرت ہے، مگر اس کی باتیں حقیقت پر مبنی ہیں۔' حالی لکھتے ہیں:

''فارسی نثر میں ظاہرا کوئی کتاب شیخ سے پہلے اور اس کے بعد ایسی نہیں لکھی

گئی جو گلستان کے برابر مقبول ہوئی ہو۔''[۳۰]

گلستان میں جس انداز سے توکل، قناعت، اخلاق و آداب اور علم و حکمت کی باتیں بتائی گئی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رالف واڈو ایمیسن (Ralph Waldo Emerson) نے سعدی کی تحریروں میں موجود حکمت و دانائی اور حسن بیان کو بائبل کے مساوی قرار دیا ہے۔ جیسے سعدی کا یہ جملہ:

''دست کرم بر کشادو داد سخاوت بداد''

(بخشش کا ہاتھ کھول دیا اور جود و سخا کی داد دی)

ڈاکٹر رضا زادہ شفق نے سعدی کے کلام کے جو امتیازات بیان کیے ہیں وہ قابل توجہ ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ سعدی نے اپنے پیش روؤں کی طرح مدح سرائی کے اندر کبھی افراط اور مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے نہایت شگفتہ اور مؤثر انداز میں بادشاہوں، فرمانرواؤں اور امرا کو عدل و انصاف، خیر خواہی اور نیکی کی تلقین کی۔ سعدی نے نثر مسجع لکھ کر اسے اعتبار بخشا، ان کے نثر کی روانی ہر اعتبار سے ان کے نظموں کی طرح ہی ہے۔ انھوں نے مختصر اور جامع عبارتوں، حکایتوں اور مثالوں کے ذریعہ پند و وعظ اور روح و نفس کی پاکیزگی کا کام کیا ہے۔

عام طور پر مسجع و مقفع عبارتیں پر تکلف اور بے حد مشکل مانی جاتی ہیں۔ فارسی ادب میں اس طرح کی کتابوں کی ایک لمبی فہرست ہے مگر حیرت ہوتی ہے کہ ''گلستان'' میں صنائع لفظی و معنوی کی کثرت اور مسجع و مقفع عبارتوں کے افراط کے باوجود اس کی عبارت اتنی سادہ ہے کہ اس کے سیکڑوں جملے ضرب المثل بن چکے ہیں۔ نمونہ کے طور پر گلستان سے کچھ عبارتیں یہاں ملاحظہ فرمائیں:

''ہر کہ دست از جان بشوید ہر چہ در دل آید بگوید''

(جو جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، جو جی میں آتا ہے بولتا ہے)

''دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز''

(مصلحت آمیز جھوٹ فتنہ انگیز سچ سے بہتر ہے)

''ہر کہ بقامت کہ تر بقیمت بہتر''

(جو چیز قامت میں چھوٹی ہے قیمت میں بڑی ہوتی ہے)

سعدی چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی باتیں کہہ دینے کا ہنر رکھتے ہیں، یہ جملے کیا ہیں کہ بقول حالی۔''ریشم کے لچھے معلوم ہوتے ہیں۔''ان جملوں کی معنویت اور گہرائی کو آپ بھی محسوس کریں:

تونگری بہ دل است نہ بمال و بزرگی بعقل است نہ بسال''
(مالداری دل سے ہوتی ہے نہ کہ مال سے اور بزرگی عقل سے ہوتی نہ کہ سال سے)

''محال است کہ ھنر مندان بمیر ندو بی ھنر ان جای ایشان گیرند۔''
(مشکل ہے کہ ہنر مند لوگ مر جائیں اور بے ہنر لوگ ان کی جگہ لے لیں)

''دہ درویش در گلیمی بخسپند و دو بادشاہ در اقلیمی نہ گنجد''
(دس فقیر ایک کمبل میں آتے ہیں لیکن دو بادشاہ ایک ملک میں نہیں سما پاتے''

''قدر عافیت کسی داند کہ بمصیبتی گرفتار آید''
(آرام کا قدر وہی جانتا ہے جو کسی مصیبت میں گرفتار ہوا ہو)

''بر رعیت ضعیف رحمت کن تا از دشمنی قوی زحمت نہ بینی''
(کمزور رعیت پر رحم کرتا کہ قوی دشمن سے زحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے)

''ظرافت بسیار ہنر ندیمان ست وعیب حکیمان''
(زیادہ ہنسی مذاق دوستوں کیلئے ہنر اور عقلمندوں کیلئے باعث عیب ہے)

معروف فرانسیسی فلسفی، مورخ، شاعر اور ناول نگار وولٹیئر (Voltair) بھی سعدی کی تحریروں خاص کر''گلستان'' سے بہت متاثر تھا اور اس کے دوست جب اسے 'سعدی' کہہ کر پکارتے تو بہت خوش ہوتا تھا۔ ذرا غور کریں کہ ایک ایسے وقت میں جب نہ جہاز تھے، نہ ریل گاڑی، نہ اخبار تھے اور ہموار راستے۔ مگر ان کے باوجود خود سعدی کی زندگی میں ہی ان کی''گلستان'' چہار دانگ عالم میں اپنی شہرت کا پرچم لہرا چکی تھی۔ دراصل سعدی کی تحریروں کا طلسم یہی ہے۔

It's very meek and modest but very difficult to duplicate

''گلستان'' کی عبارت بہت آسان ہے۔ مگر اس کی مثال بہت مشکل ہے، سعدی کی تحریروں

میں جو فصاحت و بلاغت اور سادگی و برجستگی ہے، وہ فارسی ادب کی دوسری کتابوں میں خال خال ہی نظر آتی ہے۔

گلستان کے نثر میں نظم کی سی دلکشی و رنگینی ہے اور دریا کے پانی جیسی صفائی و روانی ہے۔ اس کی عبارت کو پڑھنے پر دل سے بار بار 'ھل من مزید' کی صدا بلند ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کا یہ جملہ:

''ای برادر حرم در پیش است و حرام در پس، اگر رفتی و گر خفتی مردی۔''

(اے بھائی حرم سامنے ہے اور چور پیچھے، اگر چلے جاؤ گے محفوظ ہو جاؤ گے اور اگر سو جاؤ گے تو خود کو ہلاکت میں ڈال دو گے)

''رعیت بلدان از مکائد ایشان مرعوب و لشکر سلطان مغلوب''

(ملک کے باشندے ان کے مکر و فریب سے سہمے ہوئے تھے اور بادشاہ کا لشکر عاجز آ چکا تھا)

تشبیہات انوکھے، اچھوتے، سادہ اور شگفتہ ہیں جیسے سعدی کا یہ جملہ:

''میوۂ عنفوان شبابش نو رسیدہ و سبزۂ گلستان عذارش نو دمیدہ۔''

(اس کے آغاز جوانی کا میوہ ابھی تازہ تھا اور اس کے رخسار کے باغ پر ابھی نیا نیا سبزہ آیا تھا)

مسجع و مقفع عبارت آرائی میں بھی سعدی کا جواب نہیں۔ وہ جملوں کے الفاظ کو بہت سوچ سمجھ کر اور ناپ تول کر لکھتے ہیں، الفاظ کے یہ تانے بانے واقعتاً خیرہ کن ہیں، مثال کے طور پر ان کا یہ جملہ:

''آتش کشتن و اخگر گذاشتن، افعی کشتن و بچہ اش نگہداشتن کار خردمندان نیست۔''

(آگ بجھانا اور چنگاری کو چھوڑ دینا؛ سانپ کو مار ڈالنا اور اس کے بچے کی حفاظت کرنا، عقلمندوں کا کام نہیں ہے)

''چشمش نگران است کہ ملکش بادگران است۔''

(اس کی آنکھیں ابھی بھی دیکھ رہی ہیں کہ اس کا ملک دوسروں کے پاس ہے)

گلستان کی ان مسحور کن عبارتوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے حالی کہتے ہیں:

''اس کتاب کی عمدہ خاصیتوں میں سے ایک یہ خاصیت بھی فارسی لٹریچر میں نہایت عجیب اور قابل لحاظ ہے کہ فارسی اور اردو کی تحریر وتقریر میں جس قدر گلستان کے جملے اور اشعار اور مصرع ضرب المثل ہیں اور کسی کتاب کے نہیں دیکھے گئے ہیں۔''[۳۱]

سعدی نے گلستان کی شکل میں نظم ونثر کا وہ آمیزہ پیش کیا ہے جس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔انھوں نے وعظ ونصیحت کے حنظل کو اپنے شیریں کلامی کے شہد میں گھول کر بنی نوع انسان کو پلانے کی کوشش کی ہے کہ اسے نوش کرتے ہی خلق خدا عش عش کرتی ہے اور مستی میں جھوم اٹھتی ہے۔سعدی نے اخلاقیات جیسے خارزار موضوعات کو اپنے حسن بیان کے جادو سے گلزار بنادیا ہے۔حالی لکھتے ہیں:

''تعجب ہے کہ شیخ کی گلستان جو آئندہ نسلوں کے لیے نثر فارسی کا ایک لاجواب نمونہ تھی، ایران میں اس کے تتبع کا کسی نے خیال نہیں کیا، یا یوں کہیے کہ کسی سے اس کا تتبع نہیں ہوسکا۔اگر چہ شیخ کے بعد نثر فارسی کی ترقی یا وسعت انتہا کے درجے کو پہنچ گئی اور نثر لکھنے پر ایسے ایسے جلیل القدر فاضلوں نے کمر باندھی جن کا علم وفضل شیخ سے بہ مراتب فائق تر تھا، مگر سب کی ہمت زیادہ تر الفاظ اور صنائع لفظی پر مقصور رہی۔''[۳۲]

آندرے ڈورایر (Andre Du Ryer) پہلا یوروپین ہے جس نے سعدی کو مغرب میں متعارف کرایا۔معروف روسی شاعر الیکزنڈر رشکن (Alexander Rashkin) نے بھی اپنی شاہکار ''یوجین ونگین'' (Eugene Onegin) میں یہ کہتے ہوئے سعدی کے کلام کا حوالہ دیا ہے:

"As Sa'di said in earlier age, some are far distant, some are dead."

گلستان کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ابھی تک دنیا کی تقریباً سبھی مشہور زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

۷۵۵ میں علامہ تفتازانی نے ترکی میں اور ۷۹۴ میں سیف سرائی نے مصری وترکی میں ترجمہ کیا۔مؤخر الذکر ترجمہ آج بھی لندن کے مخطوطات میں محفوظ ہے۔۹۶۸ھ میں سروری نے اور ۱۶ ویں

صدی کے اواخر میں شمعی اور سودی نے، اسی طرح ۱۹ویں صدی عیسوی میں ہوائی، برسوی اور دیگر حضرات نے ترکی زبان میں اس کی شروحات لکھیں۔ترکی میں کیے گئے ترجموں کے بارے میں حالی لکھتے ہیں:

''استنبول کی ترکی میں اس کے متعدد ترجمے سنے گئے ہیں، جن میں سب سے اخیر ترجمہ سلطان عبدالحمید خاں کے بھائی اور ولی عہد رشاد پاشا نے حال ہی میں کیا ہے۔''[۳۳]

ان کے علاوہ لاطینی، فرانسیسی، جرمن، ڈچ اور انگریزی میں بھی اس کے ترجمے ہوئے۔ انگریزی اور دیگر یوروپی زبانوں میں کیے گئے ترجموں اور سعدی کی کلیات و بوستان وگلستان کے مختلف ایڈیشنوں کی تفصیل ''انگلش انسائیکلوپیڈیا'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔اردو زبان میں ''گلستان'' کا ترجمہ بہت سے لوگوں نے کیا ہے۔۱۸۰۱ء میں 'افسوس' کے نام اردو میں ایک ترجمہ کیا گیا جو کافی مقبول ہوا، اس کے بعد تو جیسے اردو ترجموں کی جھڑی سی لگ گئی، بہت سے علما نے مختلف ناموں سے اس کے ترجمے کیے۔ترجمہ نگاری کا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

سعدی کا اسلوب: سعدی کا اسلوب نگارش بہت انوکھا اور نرالا ہے، زبان و بیان میں سلاست وروانی پائی جاتی ہے، امثال وحکم کو بیان کرنے پر حددرجہ عبور حاصل ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی طرز نگارش کو ان کے بعد کے بہت سے بزرگوں نے اپنایا۔مہدی لایموت نے اپنے تحقیقی مقالے میں ایسی بہت سی کتابوں کا ذکر کیا ہے، جن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ''گلستان سعدی'' کی پیروی میں لکھی گئی ہیں۔ انھوں نے ان کتابوں اور ان کے مصنفین کا مختصر التعارف بھی کرایا ہے، قارئین کی دلچسپی کے لیے یہاں ان کتابوں اور ان کے سال اشاعت کا ذکر کیا جارہا ہے:

نمبر	کتاب کا نام	مصنف	سال تصنیف
۱۔	نزہۃ الارواح	امیر حسینی ہروی غوری	۸۱۷یا۹۱۷ق
۲۔	روضۂ خلد	مجدالدین خوافی	۷۳۷ق
۳۔	نگارستان	مولانا معین الدین جوینی	.....
۴۔	اخلاق الاشراف	عبید زاکانی	۷۵۱ق

۵۔ مزعفر و بغرایا ماجرای برنج و بغرا	ابواسحاق حلاج اطعمہ شیرازی	قرن ہشتم و نہم
۶۔ شکایت نامہ	محمود ذاتی	نہم ہجری
۷۔ عشق و محبت	محمد فرزند شیخ علی بیدوازی عبداللہی	.....
۸۔ بہارستان	مولانا عبدالرحمٰن جامی	۸۹۲ق
۹۔ انیس العاشقین	سید حسین ابیوردی	نہم ہجری
۱۰۔ روضۃ الشہدا	ملا حسین واعظ کاشفی	اواخر قرن نہم
۱۱۔ اخلاق محسنی	ملا حسین واعظ کاشفی	اواخر قرن دہم
۱۲۔ طریق التحقیق یا طریقۃ الحقیقہ	سعدی لاہوری	.....
۱۳۔ نظیرۂ	محمد آفندی	قرن نہم
۱۴۔ نگارستان بی مانند	ابن کمال پاشا احمد	۹۳۹ق
۱۵۔ روضۃ العشاق	خرمی تبریزی	۹۶۴ق
۱۶۔ روضۃ الاحباب	سائلی	۹۲۴ق
۱۷۔ نخلستان	قرہ قصلی	.....
۱۸۔ سنبلستان	شاہ شجاع الدین گورگانی	۹۸۹ق
۱۹۔ کتاب مولانا شیدای بلخی	مولانا شیدای بلخی	قرن دہم
۲۰۔ انیس العاقلین	ملا قاری گیلانی کاشانی	۱۰۵۰ق
۲۱۔ معدن الجواہر	ملا طرزی	۱۰۵۲ق
۲۲۔ چہار عنصر	بیدل دہلوی	قرن یازدہم
۲۳۔ رقعات	بیدل دہلوی	قرن یازدہم
۲۴۔ نکات	بیدل دہلوی	قرن یازدہم
۲۵۔ بہار دانش	منشی عنایت اللہ آل محمد صالح	۱۰۶۱ق
۲۶۔ خزان و بہار	محمد شریف بن شمس الدین متخلص کاشف	۱۰۶۳ق
۲۷۔ سراج منیر	محمد شریف بن شمس الدین متخلص کاشف	۱۰۶۳ق
۲۸۔ زینۃ المجالس	مجد الدین محمد حسینی مجدی	قرن یازدہم

۲۹۔ محبوب القلوب یا شمسہ وقہقہہ میرزا یا ملا برخوردار بن محمود ترکمن خواہی ممتاز.....
۳۰۔ بلبلستان محمد فوزی متخلص بہ مستاری .....
۳۱۔ شکرستان منت دہلوی میر قمر الدین حسینی اورنگ آبادی.....
۳۲۔ حدایق الجنان یا تجزیۃ الاحرار وتسلیۃ الابرار عبدالرزاق بیگ دنبلی آذربائیجانی قرن دوازدہم
۳۳۔ دبستان خود محمود اسماعیلی سامی ملقب بہ نعمان خان ۱۱۳۵ق
۳۴۔ جامع الاسرار نورعلیشاہ اصفہانی متخلص بہ دیوانہ .....
۳۵۔ سنبلستان محمود میرزا قاچار .....
۳۶۔ حجلۂ خیال عبدالباقی موسوی اصفہانی قرن سیزدہم
۳۷۔ پریشان میرزا حبیب اللہ قاآنی .....
۳۸۔ چمن آرا فتح علی شاہ کے عہد کا ادیب .....
۳۹۔ گنج شایگان ریاض بروجردی وسپس ہمدانی معاصر میرزا تقی خان امیر کبیر .....
۴۰۔ گلستان شوریدہ شیرازی .....
۴۱۔ شکرستان علی محمد منشی متخلص بہ حکیم .....
۴۲۔ منشآت قائم مقام میرزا ابوالقاسم قائم مقام فراہانی .....
۴۳۔ باغستان حسین قلی کلہر کرمانشاہی دورۂ قاچار
۴۴۔ کتابی بہ سبک گلستان ادب کرمانشاہی دورۂ قاچار
۴۵۔ منشآت فاضل خان میرزا محمد مشہور بہ امیر نظام گروسی .....
۴۶۔ منشآت فرہاد میرزا فرہاد میرزا معتمد الدولہ .....
۴۷۔ تضمین گلستان میرزا اسداللہ غالب دہلوی .....
۴۸۔ انجمن دانش میرزا احمد وقار شیرازی .....
۴۹۔ ریاض المحبین رضا قلی خان ہدایت طبرستانی
۵۰۔ نمکدان محمد جیحون یزدی ملقب بہ تاج الشعر
۵۱۔ نخلستان منشی لچمی نراین متخلص بہ شفیق اورنگ آبادی.....
۵۲۔ گلستان محمد شریف متخلص بہ حشمت .....

۵۳۔ قطعات منثوری بہ سبک گلستان	سید حسینی طباطبائی اردستانی متخلص بہ مجمر اصفہانی.....	
۵۴۔ صبح وصال	میرزا شفیع شیرازی متخلص بہ وصال	.....
۵۵۔ گنجینۂ معتمد	میرزا عبدالوہاب نشاط	.....
۵۶۔ خارستان	علی اکبر فراہانی	۱۳۳۵ق
۵۷۔ بہارستان	علی اکبر فراہانی	۱۳۳۵ق
۵۸۔ جان جہان	علی اکبر فراہانی	۱۳۳۵ق
۵۹۔ ملستان	میرزا ابراہیم بدایع نگار تفرشی	.....
۶۰۔ گلستان	میرزا ابراہیم بدایع نگار تفرشی	.....
۶۱۔ رضوان	میرزا آقا خان کرمانی	.....
۶۲۔ خرابات فقیر	فقیر اصطہبانا تی شیرازی	۱۳۴۲ق
۶۳۔ خارستان	میرزا قاسم ادیب کرمانی	.....
۶۴۔ ترجمۂ کتاب حاجی بابا اصفہانی	حاجی بابا اصفہانی	.....
۶۵۔ التفاصیل	فریدون توللّی	.....
۶۶۔ کاروان	فریدون توللّی	.....
۶۷۔ حکایات حجازی بنام 'آیینہ'	محمد حجازی	۱۳۱۲ق

مندرجہ بالا کتابوں کی فہرست سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ''گلستان'' نے نہ صرف عوام کے دلوں پر بادشاہت کی ہے، بلکہ فارسی کے ادیبوں اور اہل قلم کو بھی غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہے۔ دکتر مہدی حمیدی لکھتے ہیں:

''تنہا کسی کہ در شاعری و نویسندگی شہرتی معادل دارد سعدی است''[۳۴]

(شیخ سعدی وہ واحد شخص ہیں جو نظم و نثر میں یکساں طور پر شہرت رکھتے ہیں)

شیخ سعدی کا پورا کلام علم و دانش سے بھرا ہوا ہے۔ سعدی کے کلام کی حلاوت، نظافت، نزاکت، ظرافت اور شیرینی کا جواب نہیں۔ علامہ شبلی نے سعدی کے کئی ظریفانہ واقعات بیان کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ سعدی ایک دفعہ ایک کرائے کے مکان کی تلاش میں نکلے، پڑوس میں ایک یہودی

رہتا تھا، اس نے کہا کہ ضرور خریدیے، میں اس مکان سے اچھی طرح واقف ہوں، اس میں کوئی کمی نہیں ہے۔اس پر سعدی نے برملا کہا: 'بجز اس کے کہ آپ اس کے ہمسایہ ہیں۔'

اسی طرح ایک مرتبہ اتفاقاً سعدی کی ملاقات خواجہ ہمام تبریزی سے ایک حمام میں ہوگئی، شیخ نے دانستہ طور پر خواجہ ہمام سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی، مگر خواجہ ہمام ان کی صورت سے واقف نہ تھے۔ انھوں نے سعدی کا نام ونشان پوچھا تو سعدی نے کہا کہ میں شیراز میں رہتا ہوں۔ ہمام نے کہا کہ حیرت ہے کہ ہمارے شہر میں شیرازیوں کی تعداد کتوں سے بھی زیادہ ہے، شیخ نے فی الفور کہا کہ 'ہاں لیکن شیراز میں تو تبریزی کتے سے بھی کم (رتبہ) ہیں۔' بعد میں قرائن سے پتہ چلا تو ہمام اٹھ کر بڑے تپاک سے ملے، انھیں اپنے گھر لے گئے اور خوب ضیافتیں کیں۔[۳۵]

سعدی کے تعلق سے ضیا پاشا اپنی 'خرابات' میں لکھتے ہیں ''بوستان کے مطالعہ سے ہی دنیا کی ماہیت سمجھ میں آ سکتی ہے۔''[۳۶]

شاعری: سعدی کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی آزاد خیالی، لطف ادا اور جدت طرازی ہے، جو انھیں اس عہد کے دیگر فارسی گو شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ سعدی اپنے بلند افکار کو نئے نئے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ علامہ شبلی فرماتے ہیں:

''سب سے بڑی چیز جو شیخ کی خصوصیات شاعری میں ہے آزادی ہے، عرب کی شاعری کی اصل روح یہی تھی جو عجم میں آ کر گم ہوگئی تھی، عرب کے شعرا سلاطین اور امرا کے متعلق ہر قسم کے خیالات نہایت آزادی سے ادا کرتے تھے۔ متنبّی سیف الدولہ کی مدح لکھ کر لے جاتا ہے اور ساتھ ہی نہایت گستاخی اور بیباکی سے اس کو صلواتیں سناتا جاتا ہے۔ فردوسی نے بھی محمود کی جاں خراش ہجو لکھی تھی، لیکن روبرو نہیں بلکہ چوری سے اور پھر تمام بھاگتا پھرا۔ شیخ کو کئی درباروں سے تعلق رہا، ابوبکر سعد زنگی اس کا خاص ممدوح اور آقا انکیانو جو خاندان اتابک کے خاتمہ کے بعد ہلاکو خاں کے جانشین کی طرف سے شیراز کا گورنر تھا، اس سے بھی شیخ کو تعلق رکھنا پڑتا تھا۔ ان سب کے مقابلہ میں اس نے اپنی آزادی قائم رکھی۔ ابوبکر سعد نے ہلاکو خان کی اطاعت قبول کر لی تھی، یہاں تک کہ جب ہلاکو خان نے بغداد پر چڑھائی کی تو ابوبکر نے اپنے بیٹے سعد کو فوج دے کر اعانت کے لیے بھیجا اور جب بغداد میں مستعصم باللہ کے قتل کا مرثیہ لکھا اور اس قدر پر اثر لکھا کہ لوگوں کے دل ہل گئے۔ یہ مرثیہ درحقیقت ابوبکر سعد زنگی کی ہجو

تھی کہ اس نے اسلام کی تباہی اور بربادی میں ہلاکو خان کا ساتھ دیا۔ شیخ نے اس مرثیہ میں ابوبکر کا بھی ذکر کیا اور ہجو ملیح کے طور پر مدح کے پیرایہ میں چوٹ کی۔

خسرو صاحبقراں غوث زماں بوبکر سعد
آنکہ اخلاقش پسندیدہ ست و اوصافش گزیں
مصلحت بود اختیار رائے روشن بین او
زیردستاں را سخن گفتن نشاید جز چنیں

یعنی ابوبکر نے جو ہلاکو کو مدد دی تو اس میں کچھ مصلحت ہوگی۔[۳۷]

سعدی کی صاف گوئی، بیباکی اور آزاد خیالی کے بارے میں معروف ایرانی محقق منصور رستگار لکھتے ہیں:

''زیرا شاعر ایرانی ہفت صد واند سال پیش کہ ہمہ جہان غرق تاریکی جہل و خموشی بود این چنین چراغ ہدایت فرا راہ فرمانروایان عصر خود داشت وحقایق را بآنان کہ زور وزر داشتند بی پروا گفت۔''[۳۸]

اخلاقیات کا درس دینے پر سعدی کو کمال حاصل ہے۔ سعدی نے حسن اخلاق سے متعلق ہر طرح کے موضوعات مثلاً عدل وانصاف، حسن سلوک، تواضع وانکساری، صبر، شکر اور عشق ومحبت وغیرہ مضامین کا احاطہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سعدی کو بجا طور پر معلم اخلاق بھی کہا جاتا ہے، علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''اخلاقی شاعری شیخ سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی، حکیم سنائی، خیام، اوحدی، عطار نے اس زمین کو آسمان تک پہنچا دیا تھا۔ تاہم شیخ نے اس آسمان کو اور بلند کیا۔ اخلاقی شاعری پر دو حیثیتوں سے نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ (۱) کس قسم کے اخلاق کی تعلیم کی اور ان میں کس حد تک فلسفیت اور نکتہ سنجی پائی جاتی ہے۔ (۲) فلسفہ اخلاق کو کس طرح شاعرانہ پیرایہ میں ادا کیا، یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اخلاقی مسائل اگر محض سادہ طریقہ پر نظم ادا کر دیے جائیں تو وہ فلسفہ ہوگا شاعری نہ ہوگی۔ شیخ نے اخلاقی عنوان جو اختیار کیے ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں:

عدل وتدبیر، احسان عام، عشق ومحبت، تواضع، رضا بالقضا، قناعت، تربیت، شکر، توبہ، مناجات۔''

بخشش و کرم

کرم نامدار جہانت کند
کرم کامگار امانت کند
کرم مایۂ شادمانی بود
کرم حاصل زندگانی بود

(بخشش وکرم تجھے دنیا میں شہرت بخشے گی اور بخشش وکرم ہی تیرے امن وسلامتی کا ضامن بنے گی؛ بخشش شادمانی کا سرمایہ اور زندگی کا حاصل ہے)

سخاوت

سخاوت بود کار صاحبدلاں
سخاوت بود پیشۂ مقبلاں
سخاوت مس عیب را کیمیاست
سخاوت ہمہ دردہا را دواست

(سخاوت اہل دل کا کام ہے، سخاوت نیک بختوں کا پیشہ ہے؛ سخاوت تانبے جیسے عیب کے لیے بھی کیمیا ہے، یہ تمام دردوں کی دوا ہے)

تواضع

تواضع بود مایۂ دوستی
کہ عالی بود پایۂ دوستی
تواضح کند ہوش مند گزیں
نہد شاخ پر میوہ سر بر زمیں

(تواضع دوستی کا سرمایہ ہے، اس سے دوستی کا رتبہ بلند ہوتا ہے؛ عقلمند آدمی تواضع اختیار کرتا ہے، کہ میوے سے لدی شاخ ہمیشہ زمین پر ہی ہوتی ہے)

عدل

چو عدل ست پیرایۂ خسروی
چرا عدل را دل نداری قوی
چو نوشیرواں عدل کرد اختیار
کنون نام نیک ست ازو یادگار
جہان را بہ انصاف آباد دار
دل اہل انصاف را شاد دار

(جب عدل وانصاف ہی بادشاہی کا زیور ٹھہرا تو پھر انصاف کرنے کے لیے اپنا دل مضبوط کیوں نہیں بناتے؛ نوشیرواں نے عدل وانصاف قائم کیا، اسی وجہ سے آج بھی اس کی نیکنامی سے یادگار ہے؛ دنیا کو انصاف سے آباد رکھو اور اہل انصاف دل شاد رکھو)

قناعت

دلا گر قناعت بدست آوری
در اقلیم راحت کنی سروری
غنی را زر و سیم آرایش ست
و لیکن فقیر اندر آسایش ست
قناعت بہرحال اولی ترست
قناعت کند ہرکہ نیک اخترست

(اے دل! اگر تو قناعت اختیار کرلے تو کشور راحت کا شہنشاہ بن جائے گا؛ اگرچہ سونا چاندی مالدار کی زینت ہے، مگر اس کے باوجود آرام میں فقیر ہی ہے؛ بہرصورت قناعت ہی بہتر ہے، اسی لیے خوش قسمت آدمی قناعت کرتا ہے)

عشق و محبت

خوشا آتش شوق ارباب عشق
خوشا لذت درد اصحاب عشق

خوش آن دل کہ شیداست بر روئے دوست
خوش آن دل کہ شد منزلش کوئے دوست
خوشا مے پرستی ز صاحبدلان
خوشا ذوق مستی ز اہل دلان

(اہل محبت کے شوق کی آگ کتنی اچھی ہے، عشق والوں کے درد کی لذت کتنی قابل رشک ہے؛ جو محبوب کے دیدار کے لیے بے قرار ہے وہی دل بہتر ہے، محبوب کی گلی جس کی منزل ہو وہی دل قابل تحسین ہے؛ دل والوں سے مے پرستی اچھی، اہل دل سے ذوق مستی اچھی۔)

وفا

دلا در وفا باش ثابت قدم
کہ بے سکہ رائج نباشد درم
منہ پائے بیرون ز کوئے وفا
کہ از دوستان می نیرزد جفا
جدایی ز احباب کردن خطاست
بریدن زیاران خلاف وفاست

(اے دل! وفاداری میں ثابت قدم رہ، کیونکہ بغیر مہر کے درہم نہیں چلتا؛ وفا کے کوچہ سے اپنا پاؤں باہر نہ نکالنا، کیونکہ دوستوں سے بے وفائی اچھی بات نہیں؛ رفیقوں سے جدائی غلط ہے، ان سے قطع تعلق کرنا وفاداری کے خلاف ہے)

راستی

دلا راستی گر کنی اختیار
شود دولتت ہمدم و بختیار
مزن دم بجز راستی زینہار
کہ دارد فضیلت یمین بر یسار
بہ از راستی درجہان کار نیست

کہ در گلبن راستی خار نیست

(اے دل! اگر تو سچائی کا دامن پکڑ لے تو تیری تقدیر سنور جائے گی؛ سچائی کے بغیر ایک سانس بھی مت لینا، کیونکہ دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر فضیلت رکھتا ہے؛ سچائی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی کام نہیں، سچائی کے پودے میں کوئی خار نہیں)

مذمت ظلم و تعصب

خرابی ز بیداد بیند جہان
چو بستان خرم ز باد خزان
ستم کش گر آہے بر آرد ز دل
زند سوز او شعلہ در آب و گل
بآزار مظلوم مائل مباش
ز دود دل خلق غافل مباش

(ظلم کی وجہ سے ہی دنیا تباہی کا سامنا کرتی ہے، جیسے سرسبز وشاداب چمن بھی بادخزاں کے سبب مرجھا جاتے ہیں؛ ستم رسیدہ کے دل کی آہ تو پانی اور مٹی میں بھی آگ لگا سکتی ہے؛ مظلوموں کو تکلیف پہنچانے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں، خلق خدا کے دل سے نکلنے والے دھنویں سے کبھی غافل مت ہونا)

شیخ سعدی نے اخلاق کی بنیاد بے تعصبی پر قائم کی ہے، انھوں نے مختلف طریقوں سے بے تعصبی کی تعلیم دی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ تعصب کے ساتھ اخلاق کا لطیف اور نازک رشتہ قائم نہیں رہ سکتا۔ حضرت ابراہیمؑ نے ایک کافر سے جو بھی برتاؤ کیا، اس کے لیے خدا نے وحی کے ذریعہ انھیں تنبیہ کی کہ ہمارا یہ طریقہ نہیں، اس حکایت سے شیخ کو یہ بتانا مقصود تھا کہ معاشرت اور حسن اخلاق میں کافر و مسلم کی تمیز نہیں، شیخ سعدی جب بھی کسی مذہب کے بڑے پیشوا کا نام لیتے ہیں تو بہت ادب سے لیتے ہیں، دارا آتش پرست تھا پھر بھی سعدی کہتے ہیں:

شنیدم کہ دارای فرخ تبار
ز لشکر جدا ماند روز شکار

شیخ سعدی استشہاد کے طور پر اس جملے کو پیش کرتے ہیں جس میں پیغمبر اسلام نے نوشیرواں کے زمانے میں پیدا ہونے پر رشک کا اظہار کیا ہے۔

سزد گر بدورش بنازم چناں
کہ سید بہ دوران نوشیروان[۳۹]

سعدی نے شاعری کے ذریعہ پند و وعظ اور لوگوں میں اخلاقی بلندی کی تلقین کی، انھوں نے یہ روش اپنے ماقبل کے ممتاز شعرا سنائی، خیام، اوحدی، انوری اور عطار سے اپنایا۔ سعدی نے خواہشات پر غلبہ پانے کے لیے نفسانی برائیوں کی سنگینی کو بڑے مؤثر انداز میں مثالوں اور واقعات کی روشنی میں بیان کیا ہے، جس کی ترسیل معمولی سمجھ رکھنے والے انسان تک بھی بخوبی ہو جاتی ہے، علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''شیخ نے اگر چہ فلسفہ اخلاق کو شاعرانہ انداز میں لکھا لیکن مسائل اخلاق کے متعلق بہت سے ایسے نازک، دقیق اور لطیف دلائل اور وجوہ بیان کیے کہ اخلاق کے فلسفیانہ تصنیفات میں بھی نہیں مل سکتے، کبر، حسد، غیبت وغیرہ خبائث نفسانی کی برائیوں کے وجوہ تمام کتابوں میں مذکور ہیں، لیکن شیخ ان سب سے الگ دقیق باتیں پیدا کرتا ہے، بدگمانی کی برائی کی نسبت کہتا ہے:

بد اندر حق مردم نیک و بد
مگو اے جواں مرد صاحب خرد
کہ بد مرد را خصم خود می کنی
وگر نیک مرد است بد می کنی

خاموشی کی خوبیوں کے بارے میں مختلف کتابوں میں مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے، مگر سعدی کا انداز سب سے انوکھا اور نرالا ہے۔ انھوں نے خاموشی کی خوبیوں میں فلسفیانہ رنگ بھر کر اسے مزید دلچسپ اور قابل فہم بنا دیا ہے۔ سعدی کہتے ہیں کہ خاموشی پڑھے لکھے اور ان پڑھ دونوں کے یکساں طور پر مفید ہے۔ عالم کا وقار بڑھاتی ہے اور جاہل کی پردہ پوشی کرتی ہے، سعدی کے اشعار ملاحظہ کریں:

ترا خامشی اے خداوند ہوش

وقار است و نا اہل را پردہ پوش
اگر عالم ہیبت خود مبر
وگر جاہلے پردۂ خود مدر

سعدی اپنے نکتہ چینوں کی بات کا برا نہ ماننے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر کوئی تمہارا مخالف تمہارے کسی قول وفعل پر نکتہ چینی کر رہا ہو تو اس کی باتیں یا تو درست ہوں گی یا پھر غلط ہوں گی۔ پہلی صورت میں اسے برا نہ مانو اور اس برائی کو اپنے اندر سے ختم کرنے کی کوشش کرو، دوسری صورت میں اس طرف توجہ ہی مت کہ جو برائی تمہارے اندر ہے ہی نہیں، اس کے بارے میں سوچنے سے کیا فائدہ۔ سعدی کے لفظوں میں:

گرآنی کہ دشمنت گوید مرنج
ورآں نیستی گو برو باد سنج

بدمزاج لوگوں اور بداخلاق زاہدوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ جو خدا کی عبادت کرتا ہے، مگر اس کے بندوں کے ساتھ ناروا سلوک کرتا رہتا ہے، وہ دراصل حقیقی عبادت کو سمجھ ہی نہیں سکا ہے، کیونکہ بدرفتار لوگوں کی عبادت دراصل حصول ثواب کے لیے نہیں، بلکہ دفع عذاب کے لیے ہوا کرتی ہے۔ بقول سعدی:

نہ خورد از عبادت برآں بے خرد
کہ باحق نکو بود و باخلق بد

اس تعلق سے ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک شخص نجاست میں لت پت مسجد میں داخل ہونے کی کوشش کی تو مؤذن سے اس کی سرزنش کی اور سخت سست کہا، جس سے متاثر ہو کر شیخ سعدی کہتے ہیں:

گل آلودۂ راہ مسجد گرفت
زبخت نگوں طالع اندر شگفت
یکے زجر کردش کہ تبـــــــت یـــــداک
مرو دامن آلودہ درجای پاک

مرا رقتے در دل آمد بریں
کہ پاک است و خرم بہشت بریں
دراں جای پاکان امیدوار
گل آلودۂ معصیت را چہ کار[۴۰]

سعدی نے اپنی حکایتوں کے ذریعہ اظہار رائے کی آزادی کی طرف اشارہ کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہر شخص کو آزادی کے ساتھ اپنے فرمانروا پر نکتہ چینی کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہلاکو اور اس کی اولاد کی خونریزیوں سے بھلا کون ناواقف ہے، سعدی نے ہلاکو، اس کے بیٹے ابا قا خان اور اس کے پوتے ارغون خان کے زمانے کا بڑے قریب سے مشاہدہ کیا، اپنی آنکھوں سے ان کے جبر وقہر اور سلطنت بغداد کو لٹتے، بکھرتے دیکھا، ان کی سبھی کہانیوں میں بالواسطہ طور پر انا پرست بادشاہوں، مفاد پرست وزیروں اور امیروں، خودغرض عالموں، ریاکار زاہدوں اور مکار صوفیوں کے خلاف تیکھا طنز کرنے کے ساتھ ساتھ نصیحت آموزی بھی کی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی یہ حکایت کہ ایک مرتبہ بادشاہ نے ایک درویش کی حق گوئی سے ناراض ہوکر اسے قید خانہ میں ڈلوادیا، بعد میں درویش کے دوستوں نے اسے سمجھایا کہ اسے بادشاہ کے سامنے اس طرح کی باتیں نہیں کرنی چاہیے تھیں۔ درویش نے جواب دیا کہ

رسانیدن امر حق طاعت است
زنداں نہ ترسم کہ یک ساعت

کسی طرح درویش کی یہ بات بھی بادشاہ کو معلوم ہوگئی اور اس نے خبر بھجوائی کہ درویش کی یہ سزا جزوقتی نہیں بلکہ تاعمر ہے، جس کے جواب میں درویش نے کہا کہ:

کہ دنیا ہمی ساعتی بیش نیست
غم و خور می پیش درویش نیست

جب بادشاہ کو دوبارہ اس کے ردعمل کا پتہ چلا تو اس نے حکم دیا کہ اس درویش کی زبان گدی سے کھینچ لی جائے، جب درویش کو اپنی سزا کے بارے معلوم ہوا تو اس نے جواباً کہا کہ

من از بے زبانی ندارم غمی

کہ دانم کہ ناگفتہ داند ہمی[۴۱]

(کہ ہمیں اس بات کی بھی پروانہیں کیونکہ ہمیں جس سے کہنا ہے وہ بغیر کہے بھی سن لیتا ہے)

سعدی کے کلام کی ایک بہت دلچسپ خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ہر بات کو حکایت کی شکل دے دیتے ہیں اور وہ بھی ایسے مسحور کن انداز میں کہ قاری اسے پڑھ کر گھنٹوں اس کی سحر سے آزاد نہیں ہو پاتا۔ سعدی کی اسی جادو بیانی پر اظہار خیال کرتے ہوئے حالی لکھتے ہیں:

''شیخ کی جادو بیانی اور فصاحت و بلاغت کا چرچا اس کی زندگی ہی میں تمام ایران، ترکستان، تاتار اور ہندوستان میں اس قدر پھیل گیا تھا کہ اس زمانے کی حالت پر لحاظ کرنے کے بعد اس پر بمشکل یقین آتا ہے۔ خود شیخ بھی گلستان کے دیباچے میں کہتا ہے: ''ذکر جمیل سعدی کہ در افواہ عوام افتادہ، وصیت سخنش کہ در بسیط زمین رفتہ'' شیراز اور کاشغر میں کچھ کم ۱۶ سو میل کا فاصلہ ہے، اس سے پہلے شیخ کاشغر میں پہنچے، وہاں کے چھوٹے بڑے اس کے کمالات سے واقف تھے۔''[۴۲]

علامہ شبلی کہتے ہیں کہ سعدی کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی آزاد خیالی ہے جو عام طور پر عرب شعرا میں پائی جاتی تھی اور فارسی زبان میں یہ روش کہیں گم ہوگئی تھی، جسے سعدی نے دوبارہ زندہ کیا۔ زمانہ جاہلیت کا معروف شاعر زہیر بن ابی سلمی جو ہرم بن سنان کے دربار سے وابستہ تھا۔ ایک مرتبہ اس کے دربار میں حاضر ہوتے ہوئے سبھی حاضرین کو سلام کیا، جو ہرم بن سنان کو بہت اچھا لگا اور اس نے حکم صادر فرمایا کہ زہیر جب بھی دربار میں آکر مجھے سلام کرے تو اسے انعام واکرام سے نوازا جائے۔ زہیر کو یہ بات اس کی شاعرانہ طبیعت کے خلاف محسوس ہوئی، چنانچہ اس کے بعد وہ جب بھی ہرم کے دربار میں آتا تو کہتا کہ ہرم بن سنان کے سوا سبھی حاضرین کو سلام۔

اسی طرح نابغہ نے جب اپنے قصیدہ پر صلہ حاصل کیا تو سبھی نے اسے حقارت سے دیکھا، متنبّی کا تعلق سیف الدولہ کے دربار سے رہا لیکن قصیدہ سناتے وقت کھری کھوٹی سنانے سے بھی نہیں چوکتا تھا جب کہ فردوسی نے محمود کی شان میں قصیدے لکھے اور خاطر خواہ صلہ نہ ملنے پر محمود کے خلاف خاموش ہجو یہ اشعار لکھے اور اس کے بعد پوری زندگی اینجا، آنجا چھپتا اور بھاگتا پھرا، جب کہ سعدی جس نے کئی بادشاہوں کا دور دیکھا ابوبکر سعد زنگی اس کا ممدوح رہا، تاتاری فرماں روا انقیانو کے دربار سے وابستہ رہا، جوینی برادران سے وابستگی رہی، ہلاکو کے بیٹے ابا قا خان کے دربار میں بھی حاضری کی نوبت آئی

لیکن ضرورت پڑنے پر کبھی مصلحت سے کام نہیں لیا اور لطیف پیرائے پر گہرے طنز بھی کیے۔ حتیٰ کہ ہلاکو کے بیٹے اباقا خان سے بھی جب ملاقات ہوئی تو اسے بھی نصیحت کرنے سے باز نہیں رہا۔[۴۳]

حالی لکھتے ہیں کہ ہلاکو کے بیٹے اباقا خاں نے خواجہ شمس الدین جوینی سے ایک مرتبہ سعدی سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ سعدی اس کے دربار میں حاضر ہوئے، باتیں ہوئیں اور جب سعدی چلنے لگے تو اباقا خان نے کہا آپ کچھ نصیحتیں کیجئے، تو شیخ سعدی نے فرمایا' دنیا سے آخرت میں سوائے نیکی کے اور بدی کے کوئی چیز ساتھ نہیں جائے گی، اب تمہیں اختیار ہے کہ تم کس چیز کو لے جانا چاہو گے۔ اباقا خان نے کہا، اسے آپ نظم کے پیرائے میں بیان کر دیجیے تو سعدی نے برجستہ کہا:

شہیکہ پاس رعیت نگاہ میدارد
حلال باد خراجش کہ مزد چوپا نیست
دگر، نہ راعی خلق است، زہر مارش باد
کہ ہرچہ میخورد، از جزیۂ مسلمانیست[۴۴]

علامہ شبلی اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا اشعار سن کر اباقا خان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے اور وہ بار بار یہی پوچھتا رہا کہ 'میں راعی ہوں یا نہیں؟' اس پر سعدی نے کہا کہ' اگر راعی ہو تو پہلا شعر حسب حال ہے، ورنہ دوسرا، اباقا خان بار بار پوچھتا تھا کہ میں راعی ہوں یا نہیں؟ لیکن شیخ ہر بار وہی شرطیہ جواب دیتے رہے، چلتے ہوئے شیخ نے اشعار پڑھے:

بادشہ سایہ خدا باشد
سایہ با ذات آشنا باشد
نشود نقل عامہ قابل خیر
گر نہ شمشیر بادشا باشد
ملکت او صلاح نپذیرد
گر ہمہ رائے او خطا باشد
ہر صلاحے کہ در جہان آید
اثر عدل بادشا باشد

اباقاخان پراشعار کا نہایت اثر ہوا۔[۴۵]

اس زمانے میں شاعری میں مدح کی روایت عام تھی مگر سعدی پہلے شخص ہیں جنھوں نے روایت سے ہٹ کر برملا اظہار خیال کی طرح ڈالی۔ سعدی اپنی بوستان میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

بگو آنچہ دانی کہ حق گفتہ بہ
نہ رشوت ستانی و نہ رشوہ دہ
طمع بندو دفتر زحکمت بشوی
طمع بگسل و ہرچہ خواہی بگوی

شیراز کا تاتاری حکمراں انقیانو کی مدح میں کئی قصیدے قلمبند کیے، مگر انھوں نے اپنے اشعار میں اس بات کا اظہار کیا کہ جسے کسی سے کوئی غرض نہیں، جسے دنیاوی مضرت ومنفعت کی پروانہیں وہ بھلا دنیاوالوں کی پروا کیوں کرے، چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

سعدیا چندانکہ میدانی بگو
حق نباید گفتن الا آشکار
ہرکہ خوف و طمع دربار نیست
از خطا باکس نباشد وز تتار

اہل مغرب نے سعدی کو مشرقی شیکسپیئر کہا ہے، جس پر تبصرہ کرتے ہوئے حالی لکھتے ہیں:

''انگلستان کے بعض اور مصنفوں نے اس کو مشرقی شیکسپیئر کہا ہے، اگر چہ یہ تشبیہ ان مشرقی شاعروں کی نظر میں جو شکسپیئر کی شاعری سے واقف نہیں ہیں، کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی، لیکن جب کہ یہ بات مسلم ہے کہ انگریز، شیکسپیئر کو تمام دنیا کے شاعروں سے بہتر سمجھتے ہیں، تو دیکھنا چاہیے کہ جولوگ سعدی کو مشرق کا شیکسپیئر کہتے ہیں، انہوں نے اس کو کس درجے کا شاعر تسلیم کیا ہے۔''[۴۶]

سعدی اور شیکسپیئر کی شاعری میں سب سے بڑی مماثلت حقیقت نگاری ہے، ظرافت وملاحت کا عنصر دونوں شاعروں میں نمایاں نظر آتا ہے اور دونوں ہی کے بیان میں سادگی اور صفائی حد کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ حالی اسی بات کو مزید صراحت سے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شیکسپیئر کی شاعری اگرچہ سعدی کی شاعری سے بالکل مغائر ہے لیکن بعض حیثیات سے ایک

دوسرے سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ دونوں کے کلام میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ وہ عقل و عادت کی سرحد سے تجاوز نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ نیچرل حالتوں کی تصویر کھینچتے ہیں، دونوں کے کلام میں اکثر ظرافت اور شوخی کی چاشنی ہوتی ہے اور دونوں کا بیان ہمیشہ سادہ، صاف اور دلنشیں ہوتا ہے۔ اس کے سوا دونوں نے کلام کی بنیاد نصیحت اور پند پر رکھی ہے۔''[۴۷]

سعدی کی دوسرے شعرا پر فوقیت کی وجہ بیان کرتے ہوئے حالی لکھتے ہیں:

''شیخ کو اور شعرا پر اس سبب سے بہت بڑی فوقیت ہے کہ اس کی نظم و نثر دونوں مسلم الثبوت ہیں۔ یہ بات بظاہر عجیب معلوم ہوگی کہ ایران میں جتنے مسلم الثبوت شعرا گزرے ہیں، ان میں شیخ کے سوا ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کی نثر کو مثل نظم کے جمہور نے تسلیم کیا ہو۔''[۴۸]

غزلیات: غزلیات کے میدان میں سعدی اپنی مثال آپ ہیں۔ اگرچہ سعدی سے قبل بھی غزلوں کا چلن تھا لیکن باضابطہ طور پر نہیں بلکہ قصیدے میں تشبیب کے ضمن میں کہی جاتی تھیں۔ سعدی نے مدحیہ قصائد سے جس قدر احتراز کیا اسی قدر غزلوں کو جلا بخشی، انھوں نے صنف غزل کو احساسات کے اظہار کا بہترین ذریعہ بنایا۔ سعدی پہلے شخص ہیں جنھوں نے فارسی ادب میں غزل کی باضابطہ طور پر طرح ڈالی، وہ اپنے بعد کے غزل گو شعرا کے بزم آرا ہیں۔ اسی لیے انھیں غزل کا امام کہا جاتا ہے۔ علامہ شبلی فرماتے ہیں:

''حضرت امیر خسرو غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ غزل میں سعدی کا پیرو ہوں، مثنوی نہ سپہر میں لکھتے ہیں:

تا بجائے کہ حد پارسیاں
اندرین عہد دوتن گشت عیاں
زان یکے سعدی وثانیش ہمام
ہر دو را در غزل آئین تمام[۴۹]

امیر خسرو شیخ سعدی کی غزل سرائی پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

لیک اگر سوی دکر یازی دست
شعرشان ہست بدان گونہ کہ ہست

سعدی نے پہلی بار غزل کو واردات قلبی کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور غزل کے مزاج کے مطابق لطیف زبان استعمال کی۔ سعدی کی غزلیات پر اظہار خیال کرتے ہوئے حالی لکھتے ہیں:

''شیخ کا انداز بیان ابتدا ہی سے تغزل میں ایسا صاف اور سلیس ہے کہ چاروں دیوانوں میں بہ اعتبار صفائی اور سلاست کے بہت کم تفاوت محسوس ہوتا ہے۔ شاعر کے کلام میں ہمیشہ صفائی اور گھلاوٹ ایک مدت کی مشق و مہارت کے بعد آتی ہے۔ عنفوان شباب کا کلام ویسا صاف اور شستہ نہیں ہوتا جیسا سن کہولت اور بڑھاپے کا ہوتا ہے، مگر شیخ کا کلام اس سے مستثنا ہے۔ البتہ طیبات اور بدائع جو جوانی اور کہولت کے زمانے کے دیوان ہیں، ان میں اور دیوانوں کی نسبت خیالات کی نزاکت اور زور بیان زیادہ پایا جاتا ہے۔''[۵۰]

سعدی کی غزلیات دراصل ان کی صوفیانہ فکر کی عکاسی کرتی ہیں، جن میں عشق حقیقی کے معانی و مفہوم کی ترجمانی کی گئی ہے۔ سعدی کی غزلوں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے حالی لکھتے ہیں:

''شیخ اکثر غزل کی بحر اور زمین ایسی اختیار کرتا ہے جو تغزل اور تغنی کے واسطے بہت مناسب ہوتی ہے۔ نظم میں سب سے بڑا کرشمہ جو کہ اکثر اس کو نثر سے زیادہ دلفریب اور دلکش کر دیتا ہے، وزن اور قافیہ ہے، پس ظاہر ہے کہ شگفتہ زمین اور مضمون کے مناسب وزن اختیار کرنے سے نظم کی دلفریبی زیادہ ہو جائے گی۔ اسی لیے شیخ کی غزلیات ابتدا سے وجد و سماع کی مجلسوں میں گائی جاتی تھیں۔''[۵۱]

سعدی کی شاعری کو نمکدان شعر کہا جاتا ہے، اس کی وضاحت کرتے ہوئے حالی لکھتے ہیں:

''سب سے بڑی بات جو شیخ اور قدما کی غزل میں مابہ الامتیاز ہے اور جس کے سبب سے اس کے دیوان کو نمکدان شعر کہا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ شیخ کی غزل کا مدار زیادہ تر مضامین مندرجہ ذیل پر ہے..... مثلاً عشق حقیقی کی واردات اور کیفیات، عشق مجازی کے پیرائے میں بیان کرنی اور زلف و

خال وخط سے شاہد مطلق کے شیون اور صفات مراد لینی، زیادہ دلکش اور موثر ہیں، بہ نسبت اس کے کہ کھلی سورٹھ گائی جائے یعنی عشق حقیقی کو صاف صاف اس طرح بیان کیا جائے جیسے اکثر ادنی درجے کے شاعر یا موزوں طبع مولوی اور واعظ نظم میں توحید و مناجات وغیرہ لکھا کرتے ہیں۔ حضرت مولانا روم فرماتے ہیں:

خوشتر آن باشد کہ سردلبران
گفتہ آید در حدیث دیگراں

اسی طرح واعظ، زاہد، شیخ، قاضی، صوفی، محتسب اور ایسے اشخاص کو جن کی مذہب میں تعظیم کی جاتی ہے، ریاکاری اور مکر اور سالوس وغیرہ کے بہانے سے لتاڑنا اور رند، اوباش اور حسن پرست و بادہ خوار لوگوں کی، ان کی صاف باطنی، آزادی اور بے ریائی کی وجہ سے تعریف کرنی، بہ نسبت اس کے کہ رندوں کو ملامت کی جائے اور متشرع لوگوں کی تعریف کی جائے زیادہ مزیدار اور زیادہ توجہ سے سنا جاتا ہے۔''[۵۲]

سعدی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے غزل کو نازک خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اسے معنویت بخشی، انھوں نے ایرانی ادبیات میں آزادئ خیال، حق گوئی اور حق پرستی کے تصورات کو عام کیا اور عوام کو بھی حق گوئی کی دعوت دی۔ انھوں نے حسن و عشق، سوزش جذبات، نکتہ آفرینی، تخیل پردازی اور نت نئے مضامین کو غزل میں سمو کر اسے خوبصورت شکل عطا کی، یہی وجہ ہے کہ انھیں پیغمبر غزل کہا جاتا ہے۔ سعدی کی شاعری میں جذبات نگاری کی بہترین مثال دیکھنے کو ملتی ہے، علامہ شبلی فرماتے ہیں:

''شیخ کی شاعری عموماً جذبات سے لبریز ہے، وہ شاعری کی کسی صنف کو رسم اور تقلید کی حیثیت سے نہیں برتتا، وہ جانتا ہے کہ شاعری کا اصلی عنصر جذبات ہیں، اس لیے اسی وقت شعر کہتا ہے جب اس کے دل میں کوئی جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ غزل اس وقت تک محض معشوق کی مداحی تھی، شیخ نے اس میں عشق کے اصلی جذبات ادا کیے۔ جن لوگوں کا اس نے مرثیہ لکھا وہ لوگ

تھے جن کے مرنے سے اس کو سخت صدمہ پہنچا تھا، اخلاقی مضامین بھی وہ اسی وقت ادا کرتا ہے جب کسی موثر واقعہ کے پیش آ جانے سے خود اس کے دل پر سخت اثر پڑتا ہے۔ مثلاً:

تنم من بلرزد چو یاد آورم
مناجات شوریدۂ در حرم
یکیم روز بر بندۂ دل بسوخت
کہ می گفت و فرماندہش می فروخت
مرا رقتے در دل آمد بریں
کہ پاک است و خرم بہشت بریں
دراں جائے پاکان امیدوار
گل آلودۂ معصیت را چہ کار"[۵۳]

بطور نمونہ سعدی کی چند غزلیں اور ان کے تراجم کو یہاں پیش کیا جا رہا ہے:

(۱)

دوست می دارم من این نالیدن دلسوز را
تا بہ ہر نوعی کہ باشد بگذرانم روز را
شب ہمہ شب انتظار صبح رویی می رود
کان صباحت نیست این صبح جہان افروز را
وہ کہ گر من بازبینم چہر مہر افزایی او
تا قیامت شکر گویم طالع پیروز را
گر من از سنگ ملامت روی بر پیچم زنم
جان سپر کردند مردان ناوک دلدوز را
کامجویان را ز ناکامی چشیدن چارہ نیست
بر زمستان صبر باید طالب نوروز را

عاقلان خوشہ چین از سر لیلی غافلند
این کرامت نیست جز مجنون خرمن سوز را
عاشقان دین و دنیا باز را خاصیتیست
کان نباشد زاہدان مال و جاہ اندوز را
دیگری را در کمند آور کہ ما خود بندہ ایم
ریسمان در پای حاجت نیست دست آموز را
سعدیا دی رفت و فردا ہمچنان موجود نیست
درمیان این و آن فرصت شمار امروز را

- میں اس دلسوز گریہ وزاری کو پسند کرتا ہوں، تا کہ ہر طرح کے مصائب روزگار کو بھلا سکوں۔
- تمام رات اس صبح رو کے انتظار میں گزرتی ہے، کیونکہ وہ (صبح دیدار) اس روشن صبح سے کہیں زیادہ روشن افروز ہے۔
- اگر میں اس محبت افزا محبوب کا دوبارہ دیدار کرلوں تو قیامت تک کے لیے اپنے کامیاب نصیبے کا شکریہ ادا کروں گا۔
- کیا میں ملامت کے پتھر کے سبب اپنا منہ پھیرلوں، جبکہ بہادر (راہ عشق کے راہرو) اس دل دوز تیر کے سامنے سینہ سپر کر دیتے ہیں۔
- عاشقوں کو ناکامی کا مزہ چکھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں، عید نوروز کے طالب کو سردیوں پر صبر کرنا ہی پڑتا ہے۔
- خوشہ چین عقلمند (نقلی سمجھ دار) لیلیٰ کے راز سے غافل ہیں، یہ کام مجنوں خرمن سوز کے سوا کسی کے بس کا نہیں۔
- دین اور دنیا کو راہ عشق میں فنا کر دینے والے (سچے عاشق، ریاکار زاہدوں کی طرح) مال و جاہ کی ہوس میں نہیں ہوتے۔
- اے معشوق! تم دوسروں کو اپنے دام محبت میں پھنسانے کی کوشش کرو کیونکہ ہم تو خود بخود اسیر محبوب ہیں، جن کے پاؤں میں بھی ڈوریاں ہیں، لہذا حاصل کی ہوئی چیز کو حاصل کرنے

کی کیا ضرورت ہے۔

- اے سعدی! ماضی کے ایام گزر گئے، اور ابھی آنے والا کل بھی موجود نہیں، لہٰذا اس (ماضی) اور اس (مستقبل) کے درمیان آج کو غنیمت جانو۔

(۲)

برمن کہ صبوحی زدہ ام خرقہ حرام است
ای مجلسیان راہ خرابات کدامت
ہرکس بہ جہان خرمی پیش گرفتند
مارا غمت ای ماہ پری چہرہ تمامست
برخیز کہ درسایہ سروی بنشینیم
کانجا کہ تو بنشینی بر سرو قیامت
دام دل صاحب نظرانت خم گیسوست
وآنخال بناگوش مگر دانہ دامست
باچون تو حریفی بچنین جای درین وقت
گرباده خورم خمر بہشتی نہ حرامست
بامحتسب شہر بگوئید کہ زنہار
درمجلس ما سنگ میندارز کہ جامست
غیرت نہ گذارد کہ بگویم کہ مراکشت
تاخلق ندانند کہ معشوقہ کدامست
درداکہ بہ پختیم درین سوز نہانی
دانرا خبر از آتش مانیست کہ خامست
سعدی مبر اندیشہ کہ درکام نہنگان
چون درنظر دوست نشینی ہمہ کامست

- میں نے صبح کی شراب نوش کرلی ہے، اس لیے مجھ پر خرقۂ درویشی حرام ہے۔ اے محفل

والوں مجھے اتنا بتادو کہ میخانہ کا راستہ کدھر کو جاتا ہے۔

- دنیا میں ہر کسی نے اپنی خوشی کا کوئی نہ کوئی مشغلہ اختیار کرلیا، مگر اے میرے پری جمال محبوب! میرے لیے تیرا غم عشق ہی کافی ہے۔
- چلو! کسی سرو کے سائے میں جا بیٹھیں، تاکہ تو وہاں بیٹھ کر کسی سرو پر قیامت ڈھا سکے۔
- تیرے خمار گیسو اہل نظر کے دلوں کے لیے دام ہے اور تیرے کان کی لو پر بنا تل اس کا دانہ ہے۔
- تجھ جیسے دوست کے ساتھ اس جگہ پر ایسے وقت میں میں اگر شراب پیوں تو وہ شراب جنت ہوگی، جو حرام نہیں ہے۔
- شہر کے محتسب کو خبردار کردو کہ سنگ باری نہ کرے، کیونکہ ہماری محفل میں جام ہے۔
- میری غیرت اجازت نہیں دیتی کہ میں یہ بتاؤں کہ مجھے کس نے قتل کیا، کہیں لوگوں کو میرے معشوق کا پتہ نہ چل جائے کہ وہ کون ہے۔
- افسوس کہ ہم عشق کی مخفی آگ میں پک گئے، مگر جو لوگ خام ہیں، انھیں ہماری آگ کے بارے میں بھی کچھ نہیں معلوم۔
- اے سعدی ڈرومت! کہ اگر دوست کی نظروں کے سامنے تو مگر مچھ کے منھ میں چلا جائے تو عین آرزو ہے۔

(۳)

دلی کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
زعشق تابہ صبوری ہزار فرسنگ است
برادران طریقت نصیحتم مکنید
کہ تو بہ در رہ عشق آبگینہ و سنگ است
دگر بخفیہ نمی بایدم شراب و سماع
کہ نیکنامی در دین عاشقان ننگ است
چہ تربیت شنوم یا چہ مصلحت بینم
مراکہ چشم بساقی و گوش برچنگ است

بیادگار کسی دامن نسیم و صبا
گرفتہ ایم و چہ حاصل کہ باد درچنگست
بخشم رفتۂ مارا کہ می برد پیغام
بیاکہ ما سپر انداختیم اگر جنگست
بکش چنانکہ تو دانی کہ بی مشاہدہ ات
فراخنای جہان بر وجود ما تنگست
ملامت از دل سعدی فرو نشوید عشق
سیاہی از حبشی چون رود کہ خود رنگست

- ایسا دل جو عاشق بھی ہو اور صابر بھی، وہ دل نہیں پتھر ہے؛ عشق اور صبر میں ہزاروں کوس کا فاصلہ ہے۔
- اے برادران طریقت! مجھے نصیحت نہ کریں؛ کیونکہ راہ عشق میں توبہ کرنا، شیشہ و پتھر کو یکجا کرنے جیسا ہے۔
- اب چھپ چھپ کر شراب و سماع مجھے گوارا نہیں، کیونکہ عاشقوں کے مذہب میں نیکنامی باعث ننگ ہے۔
- میں نصیحت کیسے سنوں اور مصلحت کیا دیکھوں کہ میری نظر تو ساقی پر ہے اور سماعت صدائے چنگ میں محو ہے۔
- میں نے کسی کی یاد نسیم صبا کا دامن تھاما ہے، لیکن اس سے کیا حاصل کہ مٹھی میں ہوا کو تھام رکھا ہے۔
- میرے روٹھے ہوئے محبوب کو یہ پیام کون پہنچائے گا کہ اب آ بھی جاؤ! اگر لڑائی ہی ٹھہری تو ہم نے شکست تسلیم کر لی ہے۔
- مجھے قتل کر ڈالو جیسے چاہو، کیونکہ تیرے دیدار کے بغیر یہ دنیا اپنی وسعت کے باوجود مجھ پر تنگ ہو گئی ہے۔
- محض ملامت کرنے سے سعدی کے دل کا عشق زائل نہیں ہو سکتا؛ جیسے حبشی کی سیاہی ختم نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ اس کا اصلی رنگ ہے۔

(۴)

عشق ورزیدم و عقلم بملامت برخاست
ہرکہ عاشق شد ازوحکم سلامت برخاست
ہرکہ با شاہد گلروی بہ خلوت بنشست
نتواند ز سر کوی ملامت برخاست
عشق غالب شد و ازگوشہ نشینان صلاح
نام مستوری و ناموس و کرامت برخاست
گل صدبرگ ندانم بچہ رونق بشگفت
یا صنوبر بکدامین قدوقامت برخاست
درگلستان کہ مرآن گلبن خندان بنشست
سرو آزاد بہ یک پای عزامت برخاست
وی زمانی بہ تکلف بر سعدی بنشست
فتنہ بنشست و چو برخاست قیامت برخاست
گہ شنیدی کہ برانگیخت سمند غم عشق
کہ نہ اندر عقبش گرد ندامت برخاست

- میں نے عشق اختیار کیا تو میری عقل مجھے ملامت کرنے لگی کہ جس کسی نے عشق کیا اس کی سلامتی خطرے میں پڑ گئی۔
- جس کسی نے بھی حسین وجمیل محبوب کے ساتھ خلوت نشینی کی، وہ اپنے آپ کو ملامت کے کوچے سے نہیں نکال سکا۔
- عشق غالب ہوا تو اس کے سبب پرہیزگار گوشہ نشینوں کی پرہیزگاری، نیک نامی اور تقدس سب کچھ جاتا رہا۔
- مجھے نہیں معلوم کہ باغ میں ہزارے کا پھول کس رونق کے ساتھ کھلا یا صنوبر کس قدوقامت سے پروان چڑھا۔

- چمن میں میرا گلبن خندان (معشوق) جہاں بیٹھتا ہے وہاں سرو آزاد تکلفاً ایک پاؤں پر کھڑا رہتا ہے۔
- وہ محبوب دکھاوے کے واسطے ہی سہی تھوڑی دیر کے لیے سعدی کے پاس بیٹھ گیا، جیسے ایک فتنہ بیٹھ گیا لیکن جب اٹھا تو قیامت برپا کر گیا۔
- کیا تو نے کبھی سنا کہ کسی نے عشق کا گھوڑا دوڑایا ہو اور اس کے پیچھے سے ندامت کی گرد نہ اٹھی ہو؟

(۵)

ما امید از طاعت وچشم از ثواب افگندہ ایم
سایہ سیمرغ ہمت برخراب افگندہ ایم
گر بہ طوفان می سپارد یا بہ ساحل می برد
دل بہ دریا و سپر بر روی آب افگندہ ایم
محتسب گر فاسقان را نہی منکر می کند
گو بیا کز روی نامحرم نقاب افگندہ ایم
عارف اندر چرخ وصوفی درسماع آوردہ ایم
شاہد اندر رقص و افیون در شراب افگندہ ایم
ہیچ کس بی دامن ترنیست لیکن پیش خلق
باز می پوشند و ما بر آفتاب افگندہ ایم
سعدیا پرہیزگاران خود پرستی می کنند
ما دہل درگردن و خر درخلاب افگندہ ایم
رستمی باید کہ او خصمی کند بادیونفس
گر بر او غالب شویم افراسیاب افگندہ ایم

- ہم نے عبادت سے توقع منقطع کر لی اور ثواب کی امید چھوڑ دی اور اپنے سیمرغ جیسی ہمت کا سایہ ویرانے میں ڈال دیا۔
- چاہے تو وہ طوفان کے حوالے کر دے یا ساحل تک پہنچا دے، ہم نے تو اب اپنے آپ کو دریا

(عشق) کے حوالے کر ہی دیا ہے۔

- محتسب اگر گناہ گاروں کو گناہ (شراب خواری) سے منع کرتا ہے تو اس سے کہو کہ آ جائے، اب ہم نے بھی نامحرم سے نقاب ہٹا دیا ہے۔
- ہم نے عارف کو وجد میں اور صوفی کو حال میں کر دیا ہے، معشوق رقصاں ہے اور ہم نے شراب میں افیون ملا دی ہے۔
- کوئی بھی نہیں جس کا دامن تر نہیں (گناہگار نہیں)؛ یہ الگ بات ہے لوگ چھپاتے ہیں اور ہم نے تر دامنی کو خشک کرنے کے لیے دھوپ میں ڈال دیا ہے۔
- اے سعدی! پرہیزگار لوگ خود پرستی کرتے ہیں، جب ہم اپنے گناہوں کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں۔
- نفس کے دیو سے ٹکرانے کے لیے رستم جیسا جگر ہونا چاہیے؛ اگر ہم اس پر غالب آ گئے تو سمجھ لو کہ ہم نے بڑے موذی کو مار دیا۔

قصائد: سعدی نے اپنے قصائد میں وزرا اور بادشاہوں کی کبھی بھی بے جا مدح سرائی نہیں کی بلکہ نہایت بلیغ پیرایۂ بیان میں انھیں نصیحتیں کیں اور شاہانہ جاہ وجلال کو روبہ زوال بتایا۔ سعدی کی قصیدہ گوئی کے بارے میں حالی لکھتے ہیں:

> ''شیخ نے قصیدے میں کچھ زیادہ نام اور شہرت حاصل نہیں کی، یا تو اس کی طبیعت ہی قصیدہ گوئی اور مدح سرائی کی گوں نہ تھی اور یا اس نے مدح و ستائش کے طریقۂ مروجہ کو مکروہ سمجھ کر اختیار نہیں کیا، مگر چونکہ اس زمانے کے دستور کے موافق ایک ایسے نامور شاعر کو جیسا کہ شیخ تھا، کچھ نہ کچھ قصیدے کے نام سے لکھنا ضرور تھا، اس لیے اس نے کسی قدر قصائد لکھے جو کہ پہلے قصیدہ گویوں کی طرز سے بالکل مغائر ہیں۔''[۵۴]

قارئین کی دلچسپی کے لیے بطور نمونہ سعدی کے ایک قصیدہ کو یہاں رقم کیا جا رہا ہے:

ای کہ پنجاہ رفت و در خوابی
مگر این پنج روزہ دریابی

اے شخص! تیری عمر کے پچاس سال گزر گئے اور تو اب بھی خواب غفلت میں ہے۔ باقی بچے پانچ دن تو کام میں لے آ ؤ۔

تا کی این باد کبر و آتش خشم
شرم بادت کہ قطرۂ آبی

تم کب تک اس تکبر کی ہوا اور خشمگی کی آگ میں جلتے رہو گے؟ تمہیں شرمسار ہونا چاہیے کہ تمہاری حقیقت دراصل پانی کا ایک قطرہ ہے۔

کہل گشتی و ہمچنان طفلی
شیخ گشتی و ہمچنان شابی

تو ادھیڑ ہو گیا ہے پھر بھی لڑکپن میں ہے۔ بوڑھا ہوتا جا رہا ہے اور جوانی کے زعم میں ہے۔

توبہ بازی نشستہ وزچپ و راست
می رود تیر چرخ پرتابی

تو کھیلنے کے لیے بیٹھا ہے، جبکہ آسمان سے لگاتار تیرے دائیں اور بائیں سے تیروں کی بوچھار ہو رہی ہے۔

تا درین گلہ گوسفندی ہست
نہ نشنید اجل ز قصابی

اس دنیا میں جب تک ایک بکری بھی زندہ ہے تب تک موت، قصابی کرتی رہے گی۔

تو چراغی نہادہ بر رہ باد
خانۂ در ممر سیلابی

تو ایک ایسا چراغ ہے جو ہوا کے راستے میں رکھا ہوا ہے اور ایک ایسے گھر کی مانند ہے جو سیلاب کے بہاؤ پر تعمیر کیا ہوا ہے۔

گر بہ رفعت سپہر و کیوانی
ور بحسن آفتاب و مہتابی

اگر تو بلندی میں آسمان و کیوان تک پہنچ جائے اور حسن و جمال میں آفتاب و مہتاب بن جائے۔

ور بہ مشرق روی بہ سیاحی
ور بہ مغرب روی بجلابی

اگر تو سیر وسیاحت کے لیے مشرق میں جاتا ہے اور تجارت کے لیے مغرب کا رخ کرتا ہے۔

ور بہ تمکین ابن عفانی
ور بہ نیروی ابن خطابی

اگر تو وقار وتمکنت میں عثمان بن عفانؓ اور بہادری میں عمر بن خطابؓ ہے۔

ور بہ نعمت شریک قارونی
ور بہ قوت عدیل سہرابی

اگر تو مال ودولت میں قارون جیسا ہے اور طاقت وقوت میں سہراب کا ہم پلہ ہے۔

ور میسر شود کہ سنگ سیاہ
زر خالص کنی بقلابی

اگر تو موقع ملنے پر اپنی جعلسازی سے کالے پتھر کو بھی سونا بنانے کا ہنر رکھتا ہے۔

ور بہ تندی ز بادی در گذری
ور بہ شوخی چو برق بشتابی

اگر تو تیزی میں ہوا سے بھی آگے گزر جاتا ہے اور شوخی میں بجلی سے زیادہ برق رفتار ہے۔

ملک الموت را بہ حیلہ و فن
نتوانی کہ پنجہ برتابی

پھر بھی تو اپنے حیلہ وہنر سے ملک الموت کا پنجہ نہیں مروڑ سکتا۔

منتہای کمال نقصان است
گل بریزد بہ وقت سیرابی

ہر کمال کا مقدر بالآخر زوال ہے، پھول پورا کھل جائے تو زمین پر گر جاتا ہے۔

تو کہ مبدا و مرجعت این است
نہ سزاوار کبر و اعجابی

جب تیرا آغاز وانجام یہ ٹھہرا، تو پھر تمہیں تکبر وغرور نہیں کرنا چاہیے۔

خشت بالین گور یاد آور
ای کہ سر بر کنار احبابی

اے محبوب کے زانو پر سر رکھنے والے، ذرا کبھی اپنی قبر کے سرہانے کی اینٹ کو بھی یاد کرلیا کر۔

خفتنت زیر خاک خواہد بود
ای کہ در خواب گاہ سنجابی

اے سنجابی فرش پر محو خواب ہونے والے، بالآخر تجھے تو زیر زمین سونا ہے

بانگ طبلت نمی کند بیدار
تو مگر مردۂ نہ در خوابی

بانگ رحلت بھی تجھے بیدار نہیں کر رہی ہے، ایسا لگتا ہے کہ تو زندہ نہیں، مر چکا ہے

بس خلایق فریفتہ است این سیم
کہ تو لرزان بر او چو سیمابی

یہ چاندی جس کے لیے تو پارے کی طرح بے قرار ہے، بہتوں کو اپنے دام فریب میں ڈال چکی ہے۔

بس جہان دیدہ این درخت کہن
کہ تو پیچان بر او چو لبلابی

یہ بوڑھا درخت (دنیا) جس پر تو عشق پیچاں کی طرح چسپاں ہے، بہت زمانہ دیکھ چکا ہے۔

بس بگردید و بس بخواہد گشت
بر سر ما سپہر دولابی

ہمارے سر پر متواتر گردش کرنے والا یہ آسمان، بہت گردش کر چکا اور چکر لگاتا ہی رہے گا۔

تو ممیّز بہ عقل و ادراکی
تو مکرم بہ جاہ و انسابی

قدرت نے تجھے فہم وادراک اور جاہ ونسب کے ذریعہ ممتاز بنایا ہے۔

ابلہی صد و بقی و دیبا

گر بپوشد خری است عتابی

اگر کوئی بیوقوف ہزار ریشم وحریر پہن لے، پھر گدھا کا گدھا ہی رہے گا۔

نقش دیوار خانۂ تو ہنوز

گر ہمین صورتی و القابی

یہ تمہاری ظاہری صورت والقاب، گھر کے دیوار پر بنے نقش ونگار سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔

ای مرید ہوای نفس حریص

تشنہ بر نہر ہمچو جلابی

اے نفس حریص کے بندے، تو بگلے کی طرح نہر کے قریب رہ کر پیاسا رہے گا۔

قیمت خویستن خسیس مکن

کہ تو در اصل جوہر نابی

درحقیقت تو ہی سچا موتی ہے، اس لیے اپنی قیمت کو ارزاں نہ کر

دست و پای بزن بچارہ و جہد

کہ عجب درمیان غرقابی

تو عجیب وغریب بھنور میں پھنسا ہوا ہے، اس لیے پوری کوشش کر کے ہاتھ پاؤں مار لے۔

عہد ہای شکستہ را چہ طریق

چارہ ہم توبہ است و شعابی

وہ عہد وپیمان جو تو نے توڑ ڈالے ہیں، اس سے توبہ وتلافی کے سوا کوئی راہ فرار نہیں

بہ در بی نیاز نتوان رفت

جز بہ مستغفری و اوابی

بغیر توبہ واستغفار کے تو اس خدائے بے نیاز کے در پر نہیں جا سکتے۔

تو در خلق میزنی ہمہ وقت

لاجرم بی نصیب ازین بابی

تو ہمیشہ مخلوق کے در کا چکر لگاتا ہے، اسی لیے تو خالق کے در سے بھٹک گیا ہے

کی دعای تو مستجاب شود
کہ بیک روی درد و محرابی

تیری دعا آخر کیوں کر قبول ہوگی کہ تو ایک ہی ماتھے کو دو محرابوں میں ٹیکتا ہے۔

یارب از جنس ما چہ خیر آید
تو کرم کن کہ رب اربابی

اے خدا! ہمارے جنس کے لوگوں سے ہی ہماری بھلائی کیسے ممکن ہے، تو ہی کرم کر دے کہ تو شاہوں کا شاہ ہے۔

غیب دان و لطیف و بیچونی
ستر پوش و کریم و توابی

تو عالم الغیب ہے، پاک اور بے مثال ہے، تو ہی پردہ پوشی کرنے والا، کریم اور تواب ہے۔

سعدیا راستی ز خلق مجوی
چون تو در نفس خود نمی یابی

اے سعدی! تو مخلوق کے اندر راستی تلاش نہ کر، کیونکہ یہ صفت تو خود تمہارے اندر بھی نہیں ہے۔

جای گریہ است بر مصیبت پیر
تو چو کودک ہنوز لعابی

یہ تو بوڑھے شخص کی مصیبت پر رونے کا مقام ہے، جب کہ تو ابھی بھی بچوں کی طرح لہو ولعب میں مصروف ہے۔

با ہمہ عیب خویشتن شب و روز
در تگاپوی عیب اصحابی

اپنے اندر تمام برائیوں کے باوجود بھی تو شب و روز اپنے دوستوں کی عیب جوئی میں لگا رہتا ہے۔

گر ہمہ علم عالمت باشد
بی عمل مدعی و کذابی

اگر تو دنیا کے تمام علوم بھی حاصل کر لے، لیکن اگر بے عمل ہے تو تو جھوٹا اور کذاب ہے۔

پیش مردان آفتاب صفت
باضافت چو کرم شب تابی

آفتاب صفت بندگان خدا کے سامنے تیری حیثیت ایک جگنو جیسی ہے۔

پیر گشتی و رہ ندانستی
تو نہ پیری کہ طفل کتابی

تو بوڑھا ہو گیا پھر بھی راہ خدا کو نہ پہچان سکا، تو بوڑھا نہیں بلکہ طفل مکتب جیسا ہی ہے۔

مرثیہ: سعدی نے تقریباً سبھی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنف میں اپنا معتبر نمونہ کلام پیش کیا ہے۔ ذیل میں اس کے ذریعہ لکھے گئے مرثیوں میں سے ایک مرثیہ پیش کیا جا رہا ہے:

آسمان را حق بود گر خون ببارد بر زمیں
بر زوال ملک مستعصم امیر المومنین

امیر المومنین مستعصم باللہ کی حکومت کے زوال پر اگر آسمان اس زمین پر خون کی بارش بھی برسا دے تو وہ اس کا حق رکھتا ہے۔

ای محمد گر قیامت می براری سر زخاک
سر بر آور دین قیامت درمیان خلق بین

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ کو قیامت کے روز ہی قبر سے سر اٹھانا ہے، تو اب سر اٹھا کر اپنی امت کو دیکھ لیجیے کہ قیامت برپا ہو چکی ہے۔

نازنینان حرم را موج خون بیدریغ
زآستان بگذشت و ما را خون چشم از آستین

حرم خلافت کے نازنینوں کے خون کی موجیں اب آستانے سے بہہ رہی ہیں اور مارے غم کے ہماری آنکھوں کا خون آستین سے بہنے لگا ہے۔

زینہاررا ز دور گیتی و انقلاب روزگار
درخیال کس نہ گشتی کانچنان گردد چنین

گردش گیتی اور انقلاب زمانہ سے خدا کی پناہ! یہ بات کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھی کہ اس عروج کا زوال، اس طرح ہو جائے گا۔

دیدہ بردار ایکہ دیدی شوکت بیت الحرام
قیصران روم سر بر خاک و خاقان بر زمین

اے وہ شخص کہ جس نے دربار خلافت کی شان وشوکت دیکھی ہے کہ جہاں قیصران روم و خاقان اس کی خاک پر سر رکھتے تھے۔

خون فرزندان عم مصطفیٰ شد ریختہ
ہم بران خاکی کہ سلطانان نہادندی جبین

اس سرزمین پر جہاں سلطانوں کے سر جھکتے تھے، وہاں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباس کے فرزندوں کا خون بہہ رہا ہے۔

وہ کہ گر برخون این پاکان فرود آید مگس
تاقیامت در دہانش تلخ گردد انگبین

افسوس صد افسوس! اگر ان پاک طینت نفوس کے خون پر شہد مکھی بھی بیٹھ جائے، تو قیامت تک کے لیے اس کے منھ سے نکلا شہد تلخ ہو جائے۔

بعد ازین آسایش از دنیا نباید چشم داشت
قیر در انگشتری ماند چو بر خیزد نگین

اس کے بعد اب اس دنیا سے راحت کی امید فضول ہے، کیونکہ انگشتری سے اگر نگینہ نکل جائے تو صرف کالا مسالا ہی رہ جاتا ہے۔

دجلہ خونابست زین پس گرنہد سرو نشیب
خاک نخلستان بطحا را کند باخون عجین

دجلہ کا پانی خالص خون ہو گیا ہے، اب اگر یہ نشیب کی طرف بہہ نکلا تو بطحا کے نخلستانی علاقوں کو بھی خون آلود کر دے گا۔

روی دریا درہم آمد زین حدیث دردناک

می توان دانست بر رویش ز موج افتادہ چین

اس دردناک واقعہ سے رخ دریا غضب آلود ہو گیا ہے، اس کی سطح پر موجوں کی طغیانی کو دیکھ کر اس کے غصے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

گریہ بیہودہ ست و بیحاصل بود شستن بآب
آدمی را حسرت از دل و اسپ را داغ از سرین

اب رونا بیکار ہے، کیونکہ انسان کے دل کی حسرتوں اور گھوڑے کے پٹھے کے داغوں کو پانی سے نہیں دھویا جا سکتا۔

نوحہ لایق نیست برخاک شہیدان بہرآنکہ
کمترین دولت مرایشان را بود خلد برین

ویسے بھی شہیدوں کی خاک پر آہ وزاری اچھی بات نہیں، کیونکہ ان شہیدوں کی ادنیٰ جزا بھی خلد بریں ہے۔

لیکن از روی مسلمانی و راہ مرحمت
مہربان را دل بسوزد بر قراق نازنین

لیکن اسلامی رواداری اور از روئے رحمدلی ہر ہمدرد انسان کا دل اپنے ناز پروروں کے لیے ضرور دھڑکے گا۔

باش تا فردا کہ بینی روز داد و رستخیز
کز لحد با زخمہا آلودہ بر خیزد دفین

صبر کرو، کل روز حساب میں یہ دفن ہونے والے لوگ اپنے زخموں کے ساتھ حاضر ہوں گے۔

بر زمین خاک قدمشان توتیای چشم بود
روز محشر خون شان گلگونۂ رخسار عین

روئے زمین پر ان کے قدموں کی خاک لوگوں کے آنکھوں کا سرمہ تھی اور روز محشر ان کا خون حوروں کے رخسار کا غازہ ہوگا۔

قالب مجروح اگر درخاک و خون غلطد چہ باک

روح پاک اندر جوار لطف رب العالمین

زخمی بدن اگر خاک وخون میں لت پت ہوتو کوئی بات نہیں، ان کی روحیں خدا کی رحمت کے سائے میں ہیں۔

تکیہ بر دنیا نشاید کرد و دل بروی نہاد
کاسمان گاہی بمہرست ای برادر گہ بہ کین

دنیا پر بھروسہ کرنا اور اس سے دل لگانا ٹھیک نہیں، کیونکہ آسمان کبھی تو دوست ہوتا ہے اور کبھی دشمن۔

چرخ گردان و زمین گویی دوسنگ آسیاست
درمیان ہر دو روز و شب دل مردم طحین

یہ چکر لگاتے آسمان وزمین چکی کے دو پاٹ ہیں، جن کے درمیان شب وروز لوگوں کے دل پستے رہتے ہیں۔

زور بازوی شجاعت بر نیاید با اجل
چون قضا آید نہ ماند قوت رای رزین

موت کے مقابلے میں بازوئے شجاعت کا زور نہیں چلتا، جب قضا آتی ہے تو عقلمندی کام نہیں آتی۔

تیغ ہندی برنیاید روز پیکار از غلاف
شیرمردی را کہ باشد مرگ پنہان درکمین

شیرمرد کی تاک میں اگر موت بیٹھی ہوئی ہوتو پھر لڑائی میں تیغ ہندی بھی میان سے باہر نہیں نکل پاتی۔

تجربت بیفایدہ است آنجا کہ برگردید بخت
حملہ آوردن چہ سود آنرا کہ برگردید زین

جہاں قسمت روٹھی ہوئی ہوتو تجربہ بے کار ہے، جس کی زین الٹ جائے اس کا حملہ آور ہونا بے سود ہے۔

کرگسانند از پی مردار دنیا جنگجوی

ای برادر گر خردمندی چو سیمرغان نشین

یہ گدھ ہیں جو مردار دنیا کے لیے برسر پیکار ہیں، میرے بھائی اگر تجھ میں ہوشمندی ہے تو سیمرغ کی طرح گوشہ نشینی اختیار کرلے۔

ملک دنیا را چہ قیمت حاجت اینست از خدا
گو نگہدارد بمان بر ملک ایمان و یقین

دنیاوی بادشاہت کی کوئی قیمت نہیں، خدا سے اس بات کی دعا کرو کہ ہمارا ایمان و یقین قائم رہے۔

یارب این رکن مسلمانی بہ امن آباد دار
در پناہ شاہ عادل پیشوای ملک و دین

اے خدا اس اسلامی حکومت کو کسی عادل بادشاہ اور پیشوائے ملک کی پناہ میں رکھ۔

خسرو صاحب قران غوث زمان بوبکر سعد
آنکہ اخلاقش پسندیدہ است و اوصافش گزین

بادشاہ صاحب قران، غوث زمان ابوبکر بن سعد کہ جن کے اخلاق پسندیدہ اور اوصاف حمیدہ ہیں۔

مصلحت بود اختیار رای روشن بین او
زیردستان را سخن گفتن نشاید جز چنین

اس نے اپنی روشن رائے سے جو بھی فیصلہ کیا اس میں ضرور کوئی مصلحت تھی، ہم ماتحتوں کو اس کے سوا کچھ بھی کہنا مناسب نہیں۔

لاجرم در بروبحرش داعیان دولت اند
کای ہزاران آفرین برجانت از جان آفرین

بلاشبہ بحر و بر میں لاکھوں لوگ اس کی سلطنت کے لیے ہزاروں دعا گو ہیں کہ جان آفرین کی طرف سے تم پر ہزار آفریں۔

روزگارت باسعادت با دو سعدی مدح گوی

رایتت منصور و بختت یار اقبالت قرین

تیری زندگی خوش بخت رہے اور سعدی تیرا مداح ہو، تیرا علم فتحمند رہے، تو مقدر کا سکندر ہو اور تیرا اقبال بلند رہے۔

ہزلیات ومضحکات

سعدی کی مطائبات و ہزلیات اور اس کے مضحکات پر ہمیشہ سے بحث ہوتی رہی ہے، مخالفین سعدی کو اسی کے ذریعہ ان پر طعنہ زنی کا موقع فراہم ہوتا رہا ہے۔ اس تعلق سے حالی اپنے نظریات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''شیخ کی کلیات کا سب سے اخیر حصہ مجموعۂ ہزلیات ہے جو تیس بتیس صفحے سے زیادہ نہ ہوگا۔ یہ مجموعہ فی الحقیقت شیخ کے عارض کمال پر ایک نہایت بدنما مسا ہے جو شیخ کی شان سے نہایت بعید اور اس کے فضل وکمال و بزرگی کے بالکل منافی ہے۔ اس میں زیادہ تر نظم اور کسی قدر نثر ہے اور کہیں کہیں عربی عبارت بھی ہے۔ حضرت نے اس حصے میں اپنی شیخوخت اور تقدس کو بالائے طاق رکھ کر، خوب آزادی اور بیباکی سے دل کھول کر فحش و ہزل کی داد دی ہے، جس پر ہرگز یہ گمان نہیں ہوسکتا کہ یہ پوچ اور لغو اور بیہودہ کلام اسی شخص کا ہے جس کے نتائج افکار سے گلستان اور بوستان جیسی بے بہا کتابیں موجود ہیں۔ آدمی کا خطا وار اور ناقص ہونا، یہی اس کے انسان ہونے کی علامت ہے اور اس کے اقوال وافعال کا تفاوت اور اختلاف اور ان کا ہمیشہ ایک ضابطے اور قانون کے موافق سرزد نہ ہونا، یہی وہ چیز ہے جو اس کو دیگر حیوانات سے تمیز دیتی ہے۔ انسان کے خیالات کو ایک نادان بچے کی حرکتوں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے، جس کی ایک حرکت پر بے اختیار پیار کرنے کو جی چاہتا ہے اور دوسری حرکت پر حد سے زیادہ غصہ آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شیخ کی طبیعت پر ظرافت اور مزاح غالب تھا اور جب

یہ صفت حد سے گزر جاتی ہے تو اس سے فحش اور ہزل پیدا ہوتا ہے، مگر شیخ نے اس مجموعے کے شروع میں چند سطریں معذرت آمیز عربی عبارت میں لکھی ہیں جو قابل لحاظ ہیں، وہ لکھتا ہے کہ "**الزمنی بعض ابناء الملوک ان اصنف له کتابا فی الهزل علی طریق السوزنی فلم اجبه فهددنی بالقتل فلاجل ذالک اجبت امره و انشدت هذه الابیات و اناستغفر اللّٰه العظیم.** یعنی ایک بادشاہ زادے نے مجھ کو اس بات پر مجبور کیا کہ میں اس کے لیے ایک کتاب حکم سوزنی کی روش پر ہزل میں لکھوں۔ میں نے نہ مانا، اس پر اس نے مجھ کو قتل کی دھمکی دی، اس لیے ماننا پڑا اور یہ اشعار لکھے اور میں خدائے بزرگ سے توبہ واستغفار کرتا ہوں۔"[۵۵]

اگست ۲۰۱۲ء میں اقوام متحدہ کے جنرل سکریٹری بانکی مون نے ایرانیوں کو خطاب کرتے ہوئے سعدی کے ایک شعر کی طرف اشارہ کیا تھا:

"At the entrance of the United Nations, there is a magnificent carpet- I think the largest carpet the United Nations has. That adorns the wall of the United Nations, a gift from the people of Iran. Alongside it is the wonderful words of that great Persian poet, Sa'di"

بنی آدم اعضای یک پیکرند : که در آفرینش ز یک گوہرند
چو عضوی بہ درد آورد روزگار : دگر عضوہا را نماند قرار
تو کز محنت دیگران بی غمی : نشاید کہ نامت نہند آدمی

All human beings are members of one frame,
Since all, at first, from the same essence came.
When time afflicts a limb with pain
The other limbs at rest cannot remain.
If thou feel not for other's misery

A human being is no name for thee.

شیخ سعدی کا یہ شعر دنیا میں بڑھ رہی اخلاقی انحطاط، نفرت، نسل کشی، سماجی ناہمواری اور مذہبی تشدد کو مٹا کر ایک پلیٹ فارم پر کھڑا رہنے کی دعوت دیتا ہے۔

سعدی کے احوال و آثار پر سب سے جامع کتاب مولانا حالی کی ''حیات سعدی'' ہے۔ یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصہ میں سعدی کی زندگی اور دوسرے حصہ میں ان کے کلام اور ادبی کارناموں پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ ''حیات سعدی'' کے بارے میں علامہ شبلی فرماتے ہیں: ''مولانا الطاف حسین صاحب حالی نے حیات سعدی میں سعدی کے حالات اور شاعری پر جو کچھ لکھ دیا اس کے بعد کچھ لکھنا بے فائدہ ہے۔''[۵۶]

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

> حیات سعدی غالباً مفصل ترین سوانح عمری ہے۔ حالی کے بعد سعدی کے مضمون پر مولانا شبلی، پروفیسر براؤن اور فرانسیسی فاضل Masse نے بھی قلم اٹھایا ہے، لیکن مقدم الذکر کے مفصل تذکرہ لکھنے کا دعویٰ نہیں کیا۔''[۵۷]

مولانا حالی کے علاوہ علامہ شبلی نعمانی نے بھی شیخ سعدی پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ قاضی سجاد حسین کا مبسوط مقدمہ بھی اس سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ ان کے علاوہ اہل زبان نے بھی سعدی پر خاصا کام کیا ہے۔ راقم کا مضمون انھیں پیش رووں کے نقش پا کو تلاش کرنے کی ادنیٰ سعی اور سعدی کو خراج عقیدت پیش کرنے کی حقیر کوشش ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

حوالہ جات:

۱۔ حیات سعدی، خواجہ الطاف حسین حالی، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ دہلی، ۲۰۱۱، ص-۲۴۰

۲۔ ایضاً، ص-۶۶

۳۔ صنادید عجم، مہدی حسین ناصری، شانتی پریس، ۱۲-بینک روڈ، الہ آباد، ۱۹۸۹ء، ص-۱۹۳

۴۔ شعر العجم، علامہ شبلی نعمانی، حصہ دوم، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یوپی، ۲۰۱۱ء، ص-۲۵

۵۔ تاریخ ادبیات ایران، ڈاکٹر رضا زادہ شفق، اردو ترجمہ سید مبارز الدین رفعت، کتب خانہ خورشید یہ اردو بازار لاہور، پاکستان، ۲۰۱۱ء، ص-۳۲۹

۶۔ دائرہ المعارف الاسلامیہ، جلد-۱۱، ص-۴۱، اے لٹریری ہسٹری آف پرشیا، ای جی براؤن، جلد دوم، ص-۵۲۶، صنادید عجم، ص-۱۹۳
۷۔ تاریخ الادب العربی، ڈاکٹر عمر فروخ، دار العلم للملایین، ص۔ب۔۱۰۸۵، بیروت، ج-۳، ص-۶۶۷
۸۔ حیات سعدی، ص-۲۱
۹۔ شعر العجم، جلد دوم، ص-۲۵
۱۰۔ صنادید عجم، ص-۱۹۳
11. A Literary History of Persia, E.G. Brown, Vol-2, Page-526
۱۲۔ حیات سعدی، ص-۲۰
۱۳۔ ایضاً، ص-۲۰
۱۴۔ شعر العجم، جلد دوم، ص-۲۵
۱۵۔ فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ، ڈاکٹر محمد ریاض/ڈاکٹر صدیق شبلی، ص-۶۷
۱۶۔ شعر العجم، جلد دوم، ص-۳۰
۱۷۔ ایضاً، جلد دوم، ص-۴۲
۱۸۔ سعدی از دکتر منصور رستگار، کنگرۂ جہانی سعدی و حافظ، شیراز، ۱۳۵۰، ص-۱۹۰
۱۹۔ تاریخ ادبیات ایران، رضازادہ شفق، چاپخانہ دانش تہران، ۱۳۲۱، ص-۲۶۶
۲۰۔ حیات سعدی، ص-۶۹
۲۱۔ ایضاً
۲۲۔ ایضاً، ص-۶۸
۲۳۔ ایضاً، ص-۷۳
۲۴۔ حیات سعدی، ص-۷۵
۲۵۔ شعر العجم، جلد دوم، ص-۴۵
۲۶۔ ایضاً، ص-۱۴۷
۲۷۔ ایضاً، ص-۷۷
۲۸۔ حیات سعدی، ص-۱۴۳
۲۹۔ ایضاً، ص-۸۷
۳۰۔ ایضاً، ص-۷۸
۳۱۔ ایضاً، ص-۱۰۸
۳۲۔ ایضاً، ص-۹۱
۳۳۔ ایضاً، ص-۸۳

۳۴۔ سعدی از دکتر منصور رستگار، ص-۱۹۰
۳۵۔ شعرالعجم، جلد دوم، ص-۴۴ بحوالہ دولت شاہ ذکر سعدی، طبقہ چہارم، ص-۲۰۴
۳۶۔ خرابات، ۱۸۷۴، دیباچہ ص-22، ج-1
۳۷۔ شعرالعجم، جلد دوم، ص-۵۲
۳۸۔ سعدی از دکتر منصور رستگار، ص-۲۶۷
۳۹۔ شعرالعجم، جلد دوم، ص-۶۷
۴۰۔ ایضاً، جلد دوم، ص-۷۰-۶۷
۴۱۔ ایضاً، جلد دوم، ص-۵۲
۴۲۔ حیات سعدی، ص-۶۴
۴۳۔ شعرالعجم، جلد دوم، ص-۵۲
۴۴۔ حیات سعدی، ص-۵۲
۴۵۔ شعرالعجم، جلد دوم، ص-۳۹
۴۶۔ حیات سعدی، ص-۷۳، ۷۴
۴۷۔ ایضاً، ص-۷۴
۴۸۔ ایضاً، ص-۲۴۸
۴۹۔ شعرالعجم، جلد دوم، ص-۴۹
۵۰۔ حیات سعدی، ص-۱۶۸
۵۱۔ ایضاً، ص-۱۶۹
۵۲۔ ایضاً، ص-۱۷۷
۵۳۔ شعرالعجم، جلد دوم، ص-۵۵
۵۴۔ حیات سعدی، ص-۱۹۶
۵۵۔ ایضاً، ص-۲۲۶
۵۶۔ شعرالعجم، جلد دوم، ص-
۵۷۔ سرسید اور ان کے نامور رفقا، سید عبداللہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ص-۱۰۲

ظفر دارک قاسمی *

ہندوستانی مذاہب پر مسلم علماء کا تحریری سرمایہ

(۲)

ہندومت اور توحید

مولانا سید حامد علی (۱۹۹۳-۱۹۲۳ء) سابق مدیر ماہنامہ زندگی نو، اور رکن شوری جماعت اسلامی ہند نے تقابل ادیان پر نہایت وقیع اور علمی کام کیا ہے۔ ان کی اس حوالے سے کئی اہم کتابیں موجود ہیں۔ خاص طور پر انھوں نے غیر سامی ادیان (ہندومت، بدھ مت، جین مت، سکھ مت) کو اپنی تحقیق کا میدان بنایا ہے۔ ان کے علاوہ بھی آپ نے دیگر اسلامی موضوعات پر تصنیفات وتالیفات رقم کی ہیں۔ چنانچہ ان کی ایک اہم کتاب 'ہندومت اور توحید' کے عنوان سے دستیاب ہے۔ اس کتاب کی پہلی اشاعت، جولائی ۱۹۶۴ء میں ادارہ شہادت حق بارہ دری شیر افگن بلیماران سے ہوئی۔ دوسری طباعت ۱۹۶۶ء میں ہوئی۔ کتاب چھوٹے سائز کے ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنف نے پیش لفظ میں اپنی تحقیق کا طریقہ اور انداز بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں، جیسا کی آپ کو مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ ان کی یہ تصنیف بیسیوں انگریزی، ہندی اور اردو تصنیفات کا نچوڑ ہے۔ یہ سب کتابیں معیاری ہیں اور اعلی مصنفین کی تصنیف کردہ ہیں۔

* پوسٹ ڈاکٹریٹ فیلو، شعبۂ سنی دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ zafardarik85@gmail.com

کسی مذہب کو پیش کرنے کے تین طریقے ہیں:

(۱) مذہب پر اعتراض کرنے کے لیے اس کی صورت مسخ کر دی جائے۔

(۲) مذہب کو اس کے ماخذ سے جوں کا توں بیان کر دیا جائے۔

(۳) کسی مذہب کے بہترین داعی جس انداز میں اسے پیش کرتے ہیں اسی انداز میں اسے سامنے رکھ دیا جائے۔ ہم نے ہندومت کے سلسلہ میں اکثر و بیشتر تیسرا اور پھر دوسرا طریقہ اختیار کیا ہے۔، پہلی صورت سے نہ صرف اجتناب کیا ہے بلکہ تنقید کی زبان بند رکھتے ہوئے ہم نے ہندومت کی بہتر سے بہتر تصویر پیش کی ہے جو اس کے بہترین داعی اور شارح پیش کرتے ہیں۔ اس موضوع پر اتنا مستند، سنجیدہ اور وافر مواد آپ کو ان شاء اللہ تعالیٰ کہیں اور نہ مل سکے گا۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب مناظرانہ اور مجادلانہ اسلوب سے قطع نظر اصول تحقیق کو مدنظر رکھ کر صفحہ قرطاس کی گئی ہے۔ کتاب میں منفی تنقید و تنقیص اور غیر ضروری باتوں سے کلی اجتناب کیا گیا ہے۔ توازن و اعتدال پر پورے طور پر عمل کیا گیا ہے۔

مباحث کتاب

مولانا موصوف نے ہندومت میں جن مباحث و مسائل پر عالمانہ و محققانہ گفتگو کی ہے ان کی فہرست مندرجہ ذیل ہے:

(۱) ہندومت کیا ہے؟

(۲) مشترک بنیادیں

(۳) ہندومت کے ماخذ

(۴) شرک کے رجحانات

(۵) ہندو سماج میں توحید کے رجحانات۔ مذکورہ محتویات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ درج بالا پانچوں مضامین نہایت اہم اور قابل مطالعہ ہیں۔

ہندوازم کی حقیقت

فاضل مصنف نے پہلا مسئلہ یہ زیر بحث لایا ہے کہ ہندومت کیا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟

اس مسئلہ کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے قابل اطمینان بات یہ ہے کہ ہندومت کے متعلق جو بھی چیزیں پیش کی ہیں وہ علماء ہنود کی کتابوں سے پیش کی ہیں۔ چنانچہ ''جان کلارک آرچر'' کی کتاب the great religion of the modern world کے حوالے سے ہندوازم کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''ہندومت کا کوئی بانی نہیں ہے جس نے کوئی بنیادی پیغام دیا ہو۔ نہ زرتشت، عیسی علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح کا کوئی رہنما۔ ہندوؤں کے یہاں کنفیوشس کی طرح کوئی شخص بھی نہیں ہے جو طول طویل موروثی روایات کو پوری طرح مرتب کر دینے والا ہو۔ سیدھی اور سچی بات یہ ہے کہ ان کے یہاں ایسی شخصیتیں نہیں ہیں جیسے جینیوں کے یہاں مہاویر (سوامی) بدھوں کے یہاں گوتم، سانکھیہ منی اور سکھوں کے یہاں گرونانک۔ ایک مفہوم میں ہندومت کا بانی انبوہ ہے جس کی شخصیتیں تاریکی میں ہیں۔''[۱]

یہ تبصرہ ہندو کا نہیں ہے ممکن ہے اس پر تعصب کا الزام لگا دیا جائے۔ اور ان کی بات کو غلط ثابت کر دیا جائے۔ البتہ ذیل میں ہندو مفکرین کے افکار پیش کریں گے جن سے ہندو مذہب کے بارے میں پتہ چلے گا کہ وہ کس قدر گنجلک اور مبہم ہے۔ لہٰذا مصنف نے اپنے اس دعوی کی دلیل میں ہندو دانشوروں کی رائے بھی جاننے کی کامیاب سعی کی ہے۔ کرم چند موہن داس گاندھی کی کتاب 'Hindu Dharam' کے حوالے سے لکھا ہے:

> ''یہ ہندومت کی خوش قسمتی یا بدقسمتی ہے کہ اس کا کوئی سرکاری عقیدہ نہیں ہے۔ اگر مجھ سے ہندو عقیدہ کی تعریف پوچھی جائے تو میں سادہ لفظوں میں کہوں گا۔ غیر متشددانہ ذرائع سے حق کی تلاش۔ ایک شخص خدا پر اعتقاد نہ رکھتے ہوئے بھی اپنے آپ کو ہندو کہہ سکتا ہے۔ ہندومت حق کی پرزور تلاش وجستجو کا نام ہے۔ ہندومت تمام مذاہب کے سلسلہ میں انتہائی روادار۔ اس کا عقیدہ سب کو اپنی آغوش میں لیتا ہے۔''[۲]

یہ گاندھی جی کی اپنی رائے ہے۔اس اقتباس سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ہندو دھرم کسی مسلمہ یا متعین تعلیمات وارشادات کا مجموعہ نہیں جس پر عمل کر کے انسانیت کو فلاح ونجات حاصل ہو سکے۔اسی طرح عقیدہ کے سلسلے میں بھی کوئی تعلیم واضح اور روشن نہیں ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ گاندھی جی کے بقول یہ دھرم تمام مذاہب کے ساتھ رواداری اور یکسانیت کا خواستگار ہے۔مگر آج جو لوگ ہندو دھرم کے ٹھیکے دار بنے ہوئے ہیں انھوں نے مزید ہندو دھرم کی شبیہ کو اپنے سیاسی مقاصد کی حصولیابی کی خاطر داغدار کر دیا ہے۔یقیناً جو رویہ یا جس طرح سے آج چند لوگ ہندو مذہب کی ترویج واشاعت کر رہے ہیں ان کو کسی صورت میں ہندوازم کا متبع نہیں کہا جاسکتا ہے۔فاضل مصنف نے اپنی کتاب میں صدر جمہور یہ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن کی کتاب 'Eastern Religion and Western Thought' کے حوالے سے بڑا تفصیلی اقتباس نقل کیا ہے۔ذیل میں اس کی روح پیش ہے:

''ہندومت کی بنیاد کسی نسلی عامل پر نہیں ہے۔یہ فخر وجذبات کی ایک وراثت ہے جس میں ہر نسل وقوم نے اپنا خصوصی حصہ ادا کیا ہے۔موجودہ ہندومت کے بہت سے چہرے (دیوتا) انتہائی قدیم ذرائع سے ماخوذ ہیں، وہ غالباً اس دور سے بھی آگے کے ہیں جب کہ موہنجوداڑو اور ہڑپا کے لوگ (دراوڑ) اپنے بڑے بڑے شہر۔اینٹوں کے شہر بنانے میں مشغول تھے۔''[۳]

پتہ یہ چلا کہ ہندو مذہب کا کوئی متعینہ اصول وضابطہ نہیں ہے۔طبقات انسانی کے فکر و جذبات اور افکار ونظریات کا سنگم ہے۔فاضل مصنف نے اس بحث کے اختتام پر اور ہندو مفکرین کی آراء کی روشنی میں جو تجزیاتی نوٹ درج کیا ہے وہ انتہائی اہم ہے۔لہٰذا اس کو پیش کرنا نہایت ضروری ہے۔

''یہی نہیں کہ ہندو کی کوئی ایسی تعریف نہیں کی جاسکتی جس کے نتیجہ میں ہندو سماج غیر ہندو سماج سے ممتاز ہو سکے بلکہ بعض ہندو فرقے ہندو کے لفظ ہی کو ناپسند کرتے ہیں۔''[۴]

ہندوفرقوں میں باہم مشترک بنیادیں

مصنف نے اپنی کتاب میں ایک بحث یہ کی ہے کہ ہندوؤں میں بہت سے فرقے ہیں۔ان میں باہم تضاد بھی پایا جاتا ہے۔اس کے باوجود کچھ نکتے ایسے ہیں جن پر تقریباً تمام ہندوفرقے یکجا نظر آتے ہیں۔اپنے اس دعویٰ کی صداقت انھوں نے سوامی وویکانند کے ایک لیکچر سے کی ہے۔ یہ لیکچر انھوں نے ۱۸۹۷ء میں لاہور میں دیا تھا۔اس کا عنوان تھا "Hinduism and its Common Bases"

سوامی جی نے درج ذیل اقدار کو تمام ہندوفرقوں میں مشترک قرار دیا ہے:

''کچھ بڑے اصول ہیں۔میرا خیال ہے کہ ہم سب،خواہ ہم وشنو ہوں یا شیو، شاکت ہوں یا گنپتی ،قدیم ویدانتوں سے ہمارا تعلق ہو یا جدید سے متعلق ہوں یا جدید اصلاحی فرقوں سے،ان اصولوں پر یقین رکھتے ہیں۔ غالباً ہم سب یہاں موجود ہیں۔اس پہلے نکتے پر اتفاق کریں گے کہ ہم سب ویدوں پر ایمان رکھتے ہیں اور انہیں مذہبی اسرار و رموز کی ازلی وابدی تعلیمات باور کرتے ہیں کہ اس مقدس لٹریچر کا نہ کوئی آغاز ہے اور نہ کوئی انجام۔ یہ فطرت کا ہم عصر ہے جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہاء۔ ہمارے تمام مذہبی اختلافات اور ساری مذہبی کشمکش ختم ہو جانی چاہیے جب ہم اس مقدس کتاب کے حضور کھڑے ہوں۔ ہم سب اس بات پر متفق ہیں ہمارے تمام روحانی اختلافات کے لیے اپیل کی آخری عدالت یہی (مقدس کتاب) ہے۔

دوسرا نکتہ جس پر ہم سب ایمان رکھتے ہیں وہ خدا ہے جس کی طرف وقت معین پر کائنات پلٹ کر جاتی ہے۔ پھر دوسرے ادوار میں کائنات اس سے باہر آتی ہے اور ان عجیب مظاہر فطرت کا مظاہرہ کرتی ہے جنھیں کائنات کہا جاتا ہے۔ ہمارا تصور خدا مختلف ہوسکتا ہے اس کے باوجود ہم سب خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔مطلب یہ

ہے کہ جو شخص ایک مافوق الفطرت، لامحدود طاقت جس سے ہر چیز نکلی ہے، جس میں ہر چیز رہتی ہے اور جس کی طرف بالآخر ہر چیز پلٹے گی، ایمان نہیں رکھتا اسے ہندو نہیں کہا جاتا۔

تیسرا تصور، جو میں آپ کے سامنے پیش کروں گا یہ ہے کہ دنیا کی دوسری قوموں کی طرح ہمارا اعتقاد یہ نہیں کہ دنیا اتنے ہزار سال پہلے پیدا کی گئی ہے اور ایک خاص وقت آنے پر ہمیشہ کے لیے فنا کر دی جائے گی۔ اس طرح ہم یہ بھی یقین نہیں رکھتے کہ انسانی روح کائنات کے ساتھ عدم سے وجود میں لائی جائے گی۔ یہ اور ایک نکتہ ہے جس پر میرے خیال میں ہم سب متفق ہیں۔ فطرت کے بارے میں ہے۔ ہمارا یقین یہ ہے کہ اس کی کوئی ابتدا ہے نہ کوئی انتہا۔''[۵]

مذکورہ اقتباس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ سوامی جی کے نظریہ کے مطابق تمام ہندو فرقوں میں، تین قدریں مساوی تسلیم کی جاتی ہیں۔ ۱- ویدوں پر ایمان لانا اور انہیں ازلی و ابدی اور آخری اتھارٹی تسلیم کرنا۔ ۲-توحید پر ایمان رکھنا، ۳-آواگون پر ایمان و یقین رکھنا۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی مذکورہ تینوں اقدار پر ہندو فرقے متحد و متفق ہیں؟ چنانچہ اس کا جواب یہی ہے کہ آواگون کے عقیدے کے علاوہ بقیہ دونوں قدروں پر ہندو فرقے متفق نہیں ہیں۔ اس کے بہت سارے شواہد موجود ہیں۔ فاضل مصنف نے اس کی شہادت ڈاکٹر رادھا کرشنن کی کتاب 'Religion and Society' سے دی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

''دھرم کے ماخذ میں (۱) سرتی یا وید- سرتی میں وید اور تنتر دونوں شامل ہیں کیونکہ ہندومت کے کچھ فرقوں کے افراد کے نزدیک وید مذہبی سند کا ماخذ نہیں ہیں''۔[۶]

ہندو سماج میں شرک کے عناصر

ہندومت کے متعلق یہ مشہور ہے کہ ہر نفع اور نقصان کی چیز کی پوجا کر لی جاتی ہے۔ نیز تینتیس

کروڑ دیوتا ہیں جن کی پرستش ہوتی ہے۔اس سلسلے میں ان کے مذہبی مصادر کیا کہتے ہیں ذیل کی سطور میں اس پر گفتگو کی جائے گی۔مولانا سید حامد علی نے ڈاکٹر تاراچند کی کتاب 'Influence of Islam and Indian Culture' کے حوالے سے ویدک دور کے دیوتاؤں کے متعلق لکھا ہے:

''ویدوں میں دیوتا تخلیق کی اولین پیداوار ہیں، یہ فطرت کی نیم مجسم طاقتیں ہیں،ان کے اعمال میں بہت کم فرق کیا جاتا ہے اور اس لیے یہ آسانی سے ایک دوسرے میں ضم ہوجاتے ہیں،لیکن بعد کے زمانے میں ان کی شخصیتیں زیادہ متعین ہوگئیں۔ویدک دیومالا میں ایسے دیوتا شامل ہیں جو آسمان میں رہتے ہیں یا فضا میں یا زمین پر، ان کا شمار ۳۳ ہے،لیکن جن دیوتاؤں کی شان میں ویدوں کے زیادہ منتر ہیں ان میں اندر،اگنی اور سوم زیادہ بڑے شمار ہوتے ہیں۔ورن سب سے زیادہ اونچا مانا جاتا ہے۔ پرجاپتی تخلیق کا دیوتا شمار ہوتا ہے، وشنو اور شیو کو معمولی اہمیت دی گئی تھی۔قدیم تر دیومالائی نظم میں برہما خالق،مہربانی کرنے والا اور سب کا جدامجد ہونے کی حیثیت سے سب دیوتاؤں کا صدر تھا اور اگنی، یم، ورن، کبیر اور اندر سے،سب سے زیادہ دعائیں مانگی جاتی تھیں، بعد کے زمانے میں شیو اور وشنو کو غالب پوزیشن حاصل ہوگئی۔اور انھوں نے برہما کے ساتھ مل کر عظیم تثلیث قائم کرلی۔''[۷]

اس کے علاوہ بھی کئی اور اہم دلائل پیش کیے ہیں جو اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ ہندومت میں شرک کے رجحانات ان کی مذہبی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔لیکن ماہرین کا کہنا یہ ہے کہ یہ تمام تر مشرکانہ عقائد عوام میں رائج ہیں جب کہ ہندوؤں کا ایک خاص گروہ ہے جنہیں خواص کہا جاتا ہے وہ توحید کا قائل ہے۔اس کی تائید بیرونی نے اپنی کتاب 'تحقیق ماللھند' میں بھی کی ہے۔

ہندومت میں توحید کے رجحانات

اسی کے ساتھ یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ہندومت میں توحید کے عناصر ورجحانات بھی پائے

جاتے ہیں۔لیکن توحید کا عقیدہ عوام میں قطعی نہیں ہے بلکہ یہ خواص میں پایا جاتا ہے۔چنانچہ اس سلسلہ میں ویدوں میں کچھ منتر ہیں جو توحید کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

فاضل مصنف نے (رگ وید، ادھیائے ۱۶۴، شلوک ۴۶) کے توسل سے لکھا ہے:

''وہ جو ایک ہے رشی اسے بہت سے نام دیتے ہیں، وہ اگنی، یم اور ماتر شون کہہ کر پکارتے ہیں''۔

اسی طرح (رگ وید کتاب ۴، ادھیائے ۴۰ اور شلوک ۵) دوسرا شلوک ملاحظہ کیجیے:

''رشی بن کر چمکتے ہوئے آسمان میں، واسو (ہوا) بن کر درمیانی خلا میں، ہوتری (آگ) بن کر قربانی کے آتشکدہ پر، مہمان بن کر وہ گھر میں، زندگی بن کر انسان میں، اور حق کی حیثیت سے وہ ہر جگہ رہتا ہے۔''[۸]

مصنف نے ویدانت کا فلسفہ توحید بیان کیا ہے۔اس کا خلاصہ سید حامد علی کے الفاظ میں اس طرح ہیں:

''یہ ہے اپنشد یا ویدانت کا فلسفہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنشد میں تین مکاتب فکر ہیں۔ثنویت، محدود وحدت الوجود، وحدت الوجود یا لاثنویت، پہلے نظریہ کی رو سے خدا، روح، اور فطرت (مادہ) یہ تین ازلی وابدی اور مستقل وجود ہیں۔خدا صانع ہے خالق نہیں، یعنی وہ عدم سے وجود پیدا نہیں کرتا، بلکہ روح اور فطرت میں امتزاج پیدا کرتا ہے اور یہ امتزاج روح کے سابق اعمال کے اعتبار سے ہوتا ہے۔دوسرا نظریہ یہ ہے کہ خدا، فطرت اور روح، یہ تین ازلی وابدی اور لامحدود وجود ضرور ہیں۔مگر یہ تین فی الواقع ایک ہیں، فطرت اور روح خدا ہی کا ظہور ہیں۔فطرت اور روح خدا کا جسم ہیں۔اس طرح کائنات کی ہر چیز خدا ہے اور تیسرا نظریہ یہ ہے کہ کائنات محض خواب ہے، موجود صرف ایک ہی ذات ہے۔اور وہ لامحدود ہستی ہے، خدا ہے۔مادہ اور روح اسی ایک ذات سے مختلف انعکاسات

ہیں۔ باہر یہ سب فریب اور خواب ہے اور حقیقت کے اعتبار سے ہر شی خدا ہے۔ ان تینوں نظریات میں خدا کی خالقیت کو رد کر دیا گیا ہے۔''[۹]

پتہ یہ چلا ہندو دھرم کے مذکورہ فلسفۂ توحید کو، تصور توحید سے قطعی مناسبت نہیں ہے۔

ہندو مصلحین اور تصور توحید

اس سلسلے میں مصنف نے کئی فرقے اور ہندو مصلحین کا تذکرہ کیا ہے جن کی بابت یہ مشہور ہے کہ ان میں توحید کا تصور پایا جاتا تھا۔ جن لوگوں نے ہندومت کو ایک مسلک ومشرب کی لڑی میں پرونے کا کام کیا ان میں شنکر اچاریہ کا نام واضح ہے، بلکہ ہندوازم میں ان کا ایک نمایاں مقام ہے۔ ان کے متعلق ڈاکٹر تاراچند کی کتاب 'Influence of Islam and Indian Culture' کے حوالے سے تحریر کیا ہے:

''شنکر اچاریہ نہ صرف یہ کہ اپنے زمانے کی پیداوار تھے بلکہ نئے عہد کے نقیب بھی۔ موحدانہ پرستش ان کے پیش روؤں کی کوششوں سے طاقت پکڑ چکی تھی، لیکن ابھی بھی اس بات کی ضرورت باقی تھی کہ اسے فلسفہ کی مظبوط بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ اس موحدانہ رجحان کے قیام میں اسلام جیسے غیر مصالحانہ دین توحید کے ظہور سے طاقتور قوت محرکہ حاصل ہوئی۔''[۱۰]

لنگایت فرقے کے متعلق ڈاکٹر تاراچند کی مذکورہ کتاب کے حوالے سے مصنف نے لکھا ہے کہ ان کا عقیدہ توحید اس طرح تھا:

''تو ہی واحد خداوند ہے، تو ہی ازلی وابدی ہے۔ قادر مطلق خدا سے بڑھ کر کوئی لفظ نہیں، قادر مطلق خدا، پشوپتی، کل کائنات میں صرف ایک ہی خدا ہے، تمام سماوی عالم میں، تمام فانی دنیا میں اور پاتال میں ایک ہی خدا ہے۔ مجھے یہ فرضی خدا پسند نہیں آتے۔ میں کیسے کہ سکتا

ہوں کہ دیوتا جو لاکھ سے بنائے جائیں، جنھیں پگھلایا جائے یا وہ دیوتا
جنہیں آگ پر تپا کر بنایا جائے وہ اس خدا کے برابر ہو سکتے ہیں؟ میں
کیسے یہ کہہ سکتا ہوں کہ دیوتا جو وقت آنے پر بیچے جاتے ہیں، وہ اس
خدا کے برابر ہیں؟ وہ دیوتا جو خطرے کے وقت دفن کیے جاتے ہیں۔
اس خدا کے برابر ہیں؟ دیکھو دوسرے خداؤں کا ساتھ نہ تلاش کرو۔''[۱۱]

اسی طرح لنگایت کا دوسرا فرقہ سدھار، کا بھی ذکر کیا ہے۔ سماجی مصلحین میں کبیر اور گرونانک، سوامی دیانند جیسے مصلحین کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ گویا ہندومت میں توحید کا تصور ڈاکٹر تاراچند کی تحقیق کے مطابق بہت واضح ہے۔

کتاب کی افادیت

اس کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلا کہ ہندومت میں توحید کا وہ جامع اور مانع تصور نہیں پایا جاتا ہے جس طرح اسلام میں پایا جاتا۔ ہندومت کے بنیادی مصادر میں کہیں شرک اور متعدد خداؤں کی پرستش کا ذکر موجود ہے تو کہیں کہیں توحید کے بھی رجحانات پائے جاتے۔ البتہ توحید کے متعلق جو ہندو متبعین عقیدہ رکھتے ہیں وہ خواص کا ہے۔ عوام میں تو بری طرح شرک غالب آچکا ہے۔ اسی طرح یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندو مذہب کی کوئی متعین تعریف وتوصیف نہیں ہے۔ اس کے متعلق خود ہندو مفکرین غلطاں و پیچاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کوئی بھی ہندو اپنے دھرم کی کوئی جامع تعریف نہیں کر سکا ہے۔ اگر مذکورہ نکات کا سامنے رکھ کر مولانا سید حامد علی کی اس کتاب کا مطالعہ کیا جائے گا تو یقیناً تحقیق و تفتیش کے بہت سے گوشے اجاگر ہوں گے۔

وید کا تعارف

موازنۂ ادیان ہر وقت کی ضرورت واہمیت ہے۔ ہر زمانہ میں اس موضوع پر اصحاب فکر وفضل نے خدمات انجام دی ہیں۔ اگر ہم عہد رسالت کے حوالے سے گفتگو کریں تو یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں کو خطوط لکھ کر مکالمہ اور موازنۂ ادیان کی طرح ڈالی۔ اسی طرح

اس ضمن میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی اہم کارنامے ایسے ہیں جو تمام نوع انسانیت اور ارباب سیاست واقتدار کے ساتھ ساتھ پرامن روایات کے حاملین کے لیے مشعل راہ ہیں۔ نبوت سے قبل معاہدہ حلف الفضول میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شرکت، نیز مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد میثاق مدینہ کی ترتیب وتشکیل۔ یہ موازنۂ ادیان اور تفاہم، بقائے باہم کے بین ثبوت ہیں۔ اس کے بعد کے جو تاریخ اسلامی کے درخشاں ادوار گزرے ہیں ان میں بھی تقابل ادیان پر تحریری اثاثہ کے علاوہ بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ میں کافی اہم کام ہوا، اگر ہم اپنے اردگرد اور اس ترقی پذیر ماحول پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تفاہم ادیان اور مذاکرات کے لیے کافی سرگرمیاں انجام دی جارہی ہیں۔ عربی زبان وادب کے علاوہ اردو اور دیگر متداول زبانوں میں تقابل ادیان پر کام ہورہا ہے۔ اردو زبان و ادب میں بھی اس موضوع پر ہمارے اسلاف نے کافی کام کیا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک اہم کتاب/کتابچہ محمد فاروق خاں کا 'وید کا تعارف' کے نام سے اسلامیات ودینیات کے کتب خانوں کے لیے عمدہ اضافہ ہے۔ اس کتاب کو پہلی مرتبہ نومبر ۱۹۸۴ء میں شائع کیا گیا ہے۔ باردوم جنوری ۱۹۹۰ء میں شائع کیا گیا ہے۔ اس وقت ہمارے پاس جو نسخہ ہے وہ باردوم کا ہے اس کے بعد اس کی اشاعت ہوئی ہے یا نہیں اس بابت ہماری معلومات تشنہ ہیں۔ کتاب کا مطبع، روبی آفسیٹ پرنٹنگ پریس دہلی ہے۔

کتاب کے مباحث

فاضل مصنف نے اس مختصر مگر اہم کتاب میں جن مباحث کو اٹھایا ہے ان کو ذیل میں درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ویدک دھرم، ویدوں کی حالت، ویدوں کا زمانہ ترتیب، کیا وید الہامی ہیں؟ ویدوں کے مضامین، مابعد الطبیعیاتی مسائل، ویدک کہانیاں، وید میں درشن یا فلسفہ، ویدوں کے شارحین، ویدوں کی تعلیمات، جیسے مضامین کو شامل کرکے ناظرین وقارئین کی دلچسپی کو بڑھایا ہے۔ ان میں سے ہر ایک بحث مکمل کتاب کی متقاضی ہے مگر فاضل مصنف کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس مختصر رسالہ میں ان متذکرہ بالا مباحث ومضامین کو سمو دیا ہے۔ کتاب کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب میں مذکور تمام مضامین جامع ہیں۔ نیز بہت ساری باریکیاں اور علمی نکات پر مشتمل ہیں۔ ہندو دھرم کی بنیادی معلومات کا ایک عمیق سمندر اس کتابچہ کو کہا جانا مبالغہ نہیں ہوگا۔

ویدک دھرم

پہلی بحث ویدک دھرم پر ہے۔ محمد فاروق خاں نے اس مسئلہ کو انتہائی سنجیدگی اور وقیع انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''ویدک دھرم کی بنیاد ویدوں پر ہے۔ وید کا مصدر ''وِدْ'' ہے جس کے معنی جاننا، سوچنا، موجود ہونا، غور کرنا اور حاصل کرنا ہے۔ رگ وید میں تقریباً پچپن بار اس کے مشتقات بطور فعل استعمال ہوئے ہیں۔ باقی بطور اسم دولت اور خزانہ کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ ویدوں نے کہیں بھی اپنے کو وید کے نام سے موسوم نہیں کیا ہے۔ یعنی رگ وید، یجر وید، سام وید اور اتھر وید کی اصطلاح ویدوں میں نہیں ملتی۔ دوسری کتاب میں اگر انکو وید کہا گیا ہے تو دیگر کتب کو بھی وید کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، مثلاً مہا بھارت خود کو وید کہتی ہے۔، برہمن گرنتھ بھی سناتن دھرم کے عقیدے کی رو سے وید ہیں۔ نا رومنی اتھاس (ہندوؤں کے مذہبی ادب کا ایک اہم ترین حصہ) پران کو پانچواں وید بلکہ ویدوں کا وید کہتے ہیں۔''[۱۲]

مذکورہ اقتباس کے تناظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابھی عام تصور یہ تھا کہ جن کو وید کہا جاتا ہے ان کے یہ نام خود ویدوں میں مذکور ہیں۔ لیکن محمد فاروق خاں کی تحقیق کے مطابق ویدوں کے مذکورہ اسماء ویدوں کے علاوہ دیگر کتب و مصادر سے ماخوذ ہیں۔

ویدوں کی تعداد

ہندو دھرم میں یہ بھی انتہائی اہم پہلو ہے کہ آیا ویدوں کی تعداد کتنی ہے۔ سو اس بابت علماء ہنود کے علاوہ، دیگر اصحاب علم و فضل کے یہاں متعدد و متضاد آراء پائی جاتی ہیں۔ ان تمام افکار کا احاطہ یہاں مقصود نہیں ہے۔ اس ضمن میں صرف یہ بتانا ہے کہ محمد فاروق خاں نے کیا معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

''اسی طرح ویدوں کی تعداد کا تعین مشکل ہے۔ تیرتیہ برہمن میں بھی کہا گیا ہے کہ ویدوں کی کوئی حد بندی نہیں ہے۔ وشنو پران میں ہے کہ شروع میں وید ایک ہی تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس میں کمی اور اضافہ کر کے چار الگ الگ وید مرتب کیے گئے ہیں۔ اور یہ سلسلہ اتنا بڑا ہوا کہ مہامنی پتنجلی کے زمانے میں ویدوں کی تعداد گیارہ سو اکتیس تک پہنچ گئی۔ ان میں ایک سو ایک (۱۰۱) مختلف نسخے، یجروید کے ایک ہزار (۱۰۰۰) سام وید کے اکیس (۲۱) طرح کے رگ وید کے نسخے بتائے گئے ہیں۔ سوامی دیانند نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے۔ لیکن وہ چار کو وید اور باقی کو ویدوں کی شرح بتاتے ہیں۔ جو کہ صحیح نہیں کیونکہ شاکھاؤں کو شروح قرار دینے کے لیے ثبوت نہیں ملتا۔ دوسرے یہ خود چار وید جن کو سوامی جی وید قرار دیتے ہیں انہی شاکھاؤں میں شامل ہیں۔''[۱۳]

بالائی سطروں میں مذکور اقتباس کی روشنی میں یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ویدوں کی تعداد کے بارے میں خود علماء ہنود کے یہاں متنوع آراء پائی جاتی ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں جو مشہور اور عام بات ہے وہ یہ ہے کہ وید چار ہیں۔ رگ وید، سام وید، یجروید اور اتھروید۔

وید کب لکھے گئے؟

علماء ہنود کے یہاں یہ مسئلہ بھی نہایت اہم ہے کہ ویدوں کا زمانہ ترتیب وتدوین کیا ہے۔ اس بابت محققین کی مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ البتہ مولانا فاروق خاں نے اپنی کتاب 'وید کا تعارف' میں درج ذیل تحقیق پیش کی ہے:

''رگ وید جو سب سے قدیم وید ہے۔ اس کے وجود میں آنے کے بارے میں صرف اندازے سے کام لیا جاتا ہے۔ میکڈونلڈ کے خیال میں ۱۳۰۰ قبل مسیح رگ وید کا زمانہ ماننا درست ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ

اوستا اور رگ وید کی زمانہ میں کوئی خاص فرق نہیں، اوستا زمانہ تخلیق ۸۰۰ قبل مسیح مانا جاتا ہے۔ اس لیے رگ وید کا زمانہ ۱۳۰۰ ماننا مناسب ہے۔ پروفیسر یعقوبی بھی اس سے متفق ہیں۔ ریورنٹ ایمرسن اور موکس ملر دونوں ہی ہزار سے بارہ سو قبل مسیح تک کا زمانہ ہی ویدوں کے وجود میں آنے کا تسلیم کرتے ہیں۔ رگ وید کی اندورنی شہادت بتاتی ہے کہ منتروں میں آئے الفاظ کے استعمال میں دوسو برس صرف ہوں گے اس لیے ۱۴۰۰ قبل مسیح ویدک زمانہ مانا جاتا ہے۔ رگ وید کے نو منڈلوں کی زبان میں تو یکسانیت پائی جاتی ہے لیکن دسویں منڈل کی زبان موجودہ زبان کی خصوصیت کی حامل ہے۔ اوستا اور ویدوں کی زبان کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے مغرب کے علماء نے ویدوں کا زیادہ سے زیادہ تین ہزار قبل مسیح کا زمانہ مانا ہے۔ تلک ویدوں کو جیوتش کی بنیاد پر ۶۰۰۰ قبل مسیح قدیم مانتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ رگ وید کے وجود میں آنے کا زمانہ ۵۰۰ یا ۸۰۰ قبل مسیح مانا گیا ہے۔ لیکن دیانند نے ویدوں کا زمانہ وہی مانا ہے جو کائنات کے وجود میں آنے کا زمانہ ہے۔''[۱۴]

یعنی وید کب ترتیب دیے گئے اس سلسلے میں کوئی حتمی رائے نہیں ہے۔ لیکن ایک بات تو یقینی ہے وہ یہ کہ وید سناتن دھرم کا قدیم ورثہ ہے۔ پوری ہندو تہذیب کا اور ہندوازم کا انحصار انہی پر ہے۔

ویدالہامی ہیں؟

عام طور سے اہل علم کے یہاں یہ بحث گردش کرتی رہتی ہے کہ وید انسانی کلام ہے یا یہ الہامی ہیں؟ دراصل یہ گتھی خود علماء ہنود کے یہاں الجھی ہوئی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب 'ڈسکوری آف انڈیا' میں ویدوں کو انسانی تخلیق بتایا ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی اہم ہندو علماء ہیں، جو اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ وید الہامی نہیں ہیں۔ مولانا فاروق خاں نے لکھا ہے:

''مطالعۂ وید کو عام طور پر ہندو ''اپوراشی'' کہتے ہیں یعنی وہ کسی انسان یا پرش کی تخلیق نہیں ہے۔ لیکن بہت سے ہندو عالم اسے انسانوں کی تخلیق سمجھتے ہیں۔ تیتر یہ برہمن میں ہے کہ دانا رشی ویدوں کے بنانے والے ہیں۔ یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ وید، ان ۴۱۴ کے کلام کا مجموعہ ہے جن کے نام ویدوں میں ملتے ہیں۔ یوروپ کے علماء کے علاوہ سوامی ہری پرشاد، بھائی پرمانند، یاسک اچاریہ (مؤلف نرکت) وغیرہ اسی خیال کے ہیں کہ وید انسانی کلام ہے۔ پنڈت ستیہ ورت نے لکھا ہے کہ ہمارے بزرگ رشیوں نے ہی ویدوں کو تصنیف کی تھی۔ پنڈت نردیو شاستری نے اس کی تصدیق کی ہے کہ سوامی سام شری جی ویدوں کو کلام الٰہی نہیں مانتے تھے۔ اس کی تائید خود ویدوں کی اندرونی شہادتوں سے بھی ہوتی ہے۔ اسی لیے ہر سوکت پر اس رشی کا نام ہے۔ تو کلام الٰہی کے تمام صیغے مذکر اور اگر عورت کا نام ہے تو اس سوکت کے تمام صیغے مونث وارد ہوئے ہیں جو اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ وہ اس رشی مرد یا عورت کا کلام ہے۔ جن منتروں کی رشی عورتیں ہیں ان میں دو تو بہت مشہور ہیں اور ان کے ذریعہ گہرے خیالات کا اظہار ہوا ہے۔ ان دونوں کو شاکت اپاسنا میں ویدک راتری سوکت اور ویدک دیوی سوکت کہتے ہیں۔''[۱۵]

مذکورہ اقتباس کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ وید الہامی نہیں ہیں بلکہ یہ انسانی تخلیق ہے۔ مذکورہ شواہد و دلائل کے علاوہ بھی فاروق خان نے خود ویدوں کے شلوک سے یہ ثابت کیا ہے وید انسانی کلام کا مجموعہ ہے جسے بزرگ رشیوں نے قدیم زمانے میں ترتیب و تالیف کی ہے:

''اپنے گھوڑے والے ہم تمہیں منتر بناتے ہیں۔'' تمہاری پرستش کے لیے جو نئے گیت ہیں یہ منتر تمہیں خوش کریں'' یہ بھی ملاحظہ کیجیے'' ہم قابل تعریف اگنی کے لیے اس منتر کو بناتے ہیں جیسے رتھ بناتا ہے۔''[۱۶]

کتاب کی اہمیت

مولانا فاروق خاں نے اپنے اس رسالہ میں ویدوں کے تمام مسائل ومباحث کو جمع انتہائی اختصار کے ساتھ کر دیا ہے۔ خصوصا وہ مباحث جن کے متعلق مفکرین ومحققین کے علاوہ خود علماء ہنود کی آراء متضاد ہیں۔ اس لیے ویدوں کی ماہیت یا ان کے متعلق کسی تحقیقی نتیجہ تک پہنچنے کے لیے اس رسالہ کا مطالعہ انتہائی اہم ہوگا۔ اس رسالہ کا امتیاز یہ ہے کہ زبان انتہائی سلیس اور سادہ استعمال کی گئی ہے، جو قاری کی دلچسپی بڑھانے کے لیے کافی ہے۔ یہاں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ وید ہندومت کے بنیادی مصادر ہیں۔ سب سے پرانا وید رگ وید ہے۔ اس کے بعد تینوں ویدوں کا شمار ہوتا ہے۔ ویدوں پر انتھائی وقیع اور علمی گفتگو موکس ملر نے بھی کی ہے۔ اس کے علاوہ جو سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ویدوں کو اپنی تحقیقی سرگرمیوں کا میدان بنایا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر گستاؤلی بان نے اپنی معروف تصنیف 'تمدن ہند' میں بھی ایک باب کے اندر ویدک عہد اور اس سے وابستہ چیزوں پر کافی دلچسپ بحثیں کی ہیں جو اہل علم کے لیے قابل مطالعہ ہیں۔ گویا ہندوازم میں کئی ایسی بنیادی باتیں ہیں جن کا حل ابھی تک خود علماء ہنود پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ رسالہ محققین کے لیے کافی دلچسپی کا باعث ہے۔ کیونکہ اس میں اصل مدعا انتھائی اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا، اور بہتر کلام وہی مانا جاتا ہے جو مختصر ہو اور مدلل ہو۔ ویدوں کے تعارف کے ساتھ ساتھ اس رسالہ سے جو تحریک ملتی ہے وہ بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس لیے ہندودھرم کی حقیقت سے آشنا ہونے کے لیے لازمی ہے کہ اس رسالہ کا مطالعہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ دعوتی پہلو سے بھی اس رسالہ کی ضرورت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

مطالعۂ مذاہب کی اسلامی روایت

تقابل ادیان پر 'مطالعۂ مذاہب کی اسلامی روایت' کے نام سے ایک شاہ کار اور معتبر ومستند تصنیف، معروف اسلامی اسکالر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، شعبہ دینیات سنی کے مؤقر استاد پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی کی ہے۔ اس کتاب کو ہندوستان کے معروف علمی، فکری اور تحقیقی ادارہ دارالمصنّفین، شبلی

اکیڈمی نے ۲۰۱۹ء میں شائع کیا ہے۔ کتاب کے محتویات میں ایک مقدمہ، پیش لفظ اور دس ابواب ہیں۔ قارئین کی توجہ اور دلچسپی کے لیے ذیل میں کتاب کے مشمولات کی فہرست بھی قلمبند کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

باب اول میں عہد نبوی اور عہد صحابہ میں جو مکالمے واقع ہوئے ہیں ان پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ مثلاً قرآن کریم اور بین المذاہب مکالمہ، رسول کریم اور عتبہ بن ربیعہ کا مکالمہ، رسول کریم اور یہودی علماء کا مکالمہ، رسول کریم اور عیسائی وفد کا مکالمہ، جعفر طیار اور نجاشی کا مکالمہ، مصعب بن عمیر اور اسید بن حضیر کا مکالمہ، حاطب اور شاہ مصر کا مکالمہ، زہرہ اور رستم کا مکالمہ، وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے باب میں مسلم سلاطین کے دور حکومت میں تقابل ادیان پر جو خدمات انجام دی گئی ہیں ان پر محققانہ گفتگو کی گئی ہے، مثلاً ہندوستان میں بین المذاہب مکالمہ، سندھ میں مسلم بودھ مکالمہ، اکبر کے عہد میں بین المذاہب مکالمہ، جہانگیر کے عہد میں بین المذاہب مکالمہ، انگریزوں کے عہد میں بین المذاہب مکالمہ، سرسید احمد خان اور لائف آف محمد کا جواب، جیسے اہم اور ناگزیر مباحث شامل ہیں۔

تیسرا باب البیرونی کی متداول کتاب 'تحقیق ماللهند' پر مشتمل ہے۔ اس میں بیرونی کی کتاب کا تعارف اور اس کے ضروری گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ چوتھا باب ابن حزم ظاہری کی کتاب 'الفصل فی الملل و الا هواء و النحل' پر مشتمل ہے۔ اس باب میں بھی کتاب کا مکمل تعارف کرانے کے بعد، مجوسی، صابی، مانی، برہمن، یہودی، عیسائی، وغیرہ کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ پانچواں باب، شہرستانی کی کتاب 'الملل و النحل' پر مشتمل ہے، اس باب میں یہودی مذہب، عیسائی مذہب، ثنوی مذہب، صابی مذہب، فلاسفہ کے عقائد اور ہندو مذہب کی بابت تفصیلات کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ چھٹا باب، علامہ ابن تیمیہ کی کتاب ' الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح' پر مشتمل ہے۔ اس باب میں الجواب الصحیح کی اہمیت، عیسائی پادری کا محاسبہ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تمام انسانوں کے لیے، موجودہ عیسائی مذہب، تثلیث و اتحاد کی تردید، توریت وانجیل مستند نہیں ہے، اقانیم ثلثہ کی تردید، عیسائیت میں گمراہی کی ابتدا، تجسیم وحلول کا عقیدہ، کیا شریعت صرف دو ہیں، توریت وانجیل میں نبوت محمدی کی بشارت اور حضرت عیسی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ ساتواں باب، ابن قیم کی کتاب 'هداية

الحیاری فی اجوبۃ الیھود و النصاری' پر ہے۔اس باب میں بعثت کے وقت دنیا کے مذاہب، دین میں جبر نہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی علامات اور علماء یہود، محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے عیسائی سردار، فارقلیط کون ہے، توریت و انجیل میں کتمان، عیسائی کونسل، توریت میں تحریف جیسے نکات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔آٹھویں باب، مغل حکمراں شاہجہان کے دور میں لکھی گئی کتاب 'دبستان مذاہب' پر ہے۔اس باب میں الہامی اور غیر الہامی مذاہب پر گفتگو کی گئی ہے۔نواں باب، سرسید کی تفسیر توریت، '**تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ و الانجیل علی ملۃ الاسلام**' پر ہے۔اس باب میں تبیین الکلام کی وجہ تالیف، بائبل میں تحریف کا مسئلہ، بائبل میں اختلاف عبارت، کتب مقدسہ کے ترجمے کے مسائل، ناسخ و منسوخ کی بحث جیسے بنیادی مباحث شامل ہیں۔دسواں باب مولانا عنایت رسول چریاکوٹی کی تفسیر توریت، 'بشری' کے نام پر مشتمل ہے، اس باب کے بھی عناوین بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی کی کتاب 'مطالعہ مذاہب کی اسلامی روایت' کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس کا ہر باب نہایت جامع اور علمی و تحقیقی نکات سے مملو ہے۔

زبان سادہ اور سلیس ہے، گنجلک اور پیچیدہ عبارتوں کے استعمال سے کلی طور پر اجتناب کیا گیا ہے۔مصنف کی کوشش یہ رہی کہ اس کتاب کو بڑی آسانی سے اردو دان طبقہ سامی اور غیر سامی ادیان کے متعلق خاصی شد بد پیدا کرسکتا ہے۔

کتاب پر انتہائی فاضلانہ اور محققانہ مقدمہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کے ڈائریکٹر پروفیسر اشتیاق ظلی کا ہے۔جب کہ پیش لفظ خود مصنف نے تحریر کیا ہے۔

سبب تالیف

پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی کتاب کے پیش لفظ میں سبب تالیف پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

> ''ایک عرصے سے مجھے یہ خیال تھا کہ دوسرے مذاہب کے مطالعہ کی جو تحریک قرآن سے مسلمانوں کو ملی اور رسول پاک نے جس طرح

دوسرے مذاہب کے علماء سے مکالمہ کیا، سلف صالحین نے جس محنت سے دوسرے مذاہب کا مطالعہ کیا اور ان کے پیشواؤں سے مکالمہ اور مناظرہ کیا، نیز دوسرے مذاہب پر جو تحقیقی کتابیں لکھیں ان کا تعارف اور تجزیہ کیا جائے۔ عصر حاضر میں اس مطالعہ کی اہمیت یوں بڑھ گئی ہے کہ مغرب کی یونیورسٹیوں میں بھی مذاہب کے مطالعہ اور مذاہب کے درمیان افہام وتفہیم کے شعبے کھل گئے ہیں اور مسلم دنیا میں بھی اس کے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ حالانکہ کہ مغربی ممالک نے مذاہب کا مطالعہ انیسویں صدی سے کرنا شروع کیا ہے۔ اور مکالمہ کی ابتدا بھی سیریا کے شہر ''حمدون'' سے ہوئی ہے جس میں عیسائیوں کے مختلف اور متحارب فرقوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے مکالمہ کی داغ بیل ڈالی گئی۔ پھر اسے دوسرے مذاہب تک پھیلایا گیا۔ جب کہ مسلمانوں نے بہت پہلے بین المذاہب مطالعہ اور مکالمہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ مسلم بادشاہوں نے اپنے یہاں دوسرے ادیان ومذاہب کے رہنماؤں کو آنے کی دعوت دی اور اپنے مذہب کا تعارف کرانے کی پیش کش کی۔ اس سلسلہ میں عباسی خلفاء اور ہندوستان کے مغل حکمراں بہت مشہور ہیں۔ لہٰذا مطالعہ مذاہب مسلمانوں کی قدیم روایت ہے، مغرب کی ایجاد نہیں۔ البتہ مغرب نے مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق ضرور یاد دلایا ہے۔ اسی احساس کے پیش نظر یہ کتاب لکھی گئی ہے۔''[۱۷]

مذکورہ اقتباس کے تناظر میں یہ بڑے وثوق واعتماد سے کہا جاسکتا ہے کہ جو مکالمہ کو مغرب کی ایجاد قرار دیتے ہیں ان کا نظریہ درست نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے اکابر نے اس باب میں بیش بہا تحقیقی وعلمی سرمایہ چھوڑا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ وتہذیب کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ مسلم مفکرین نے تقابل ادیان پر جو کام کیا ہے وہ ہر دور اور ہر زمانہ میں جلی حروف سے ثبت کیا جائے گا۔

کتاب پر مفکرین کی آراء

پروفیسر اشتیاق ظلی نے موجودہ دور میں فاضل مصنف کی کتاب کی افادیت واہمیت کو انتہائی خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے، اسی کے ساتھ اس مختصر مگر اہم مقدمہ میں تقابل ادیان اور مطالعہ ادیان کی ہندوستان میں تاریخ اور اس سلسلے میں مسلم اسکالرس کی کاوشوں کا بھی مختصراً تعارف کرایا ہے۔ ادھر تکثیری سماج میں بقائے باہم اور پرامن رہنے کے اسلوب وآداب کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ نیز انھوں نے بتایا ہے کہ اس وقت ہم ایک مخلوط اور رنگارنگی، تعدد پسند معاشرے میں سانس لے رہے ہیں، لہٰذا امت مسلمہ کو ایسا جتن اور کردار ادا کرنا ہے کہ جس سے کسی بھی نظریہ اور فکر وخیال کا حامل اپنی زبان پر حرف شکایت نہ لا سکے۔ مطالعۂ ادیان اور تقابل ادیان کی روایت کو فروغ دینے سے جہاں علمی وفکری، جہات روشن وتابناک ہوتی ہیں، وہیں تکثیری سماج میں باہم مل جل کر گزر بسر کرنے کی بھی جڑیں مستحکم ہوتی ہیں۔ چنانچہ پروفیسر اشتیاق ظلی، رقم طراز ہیں:

> ''آج کی دنیا میں جو ایک گلوبل ولیج کی صورت اختیار کر چکی ہے، جہاں مختلف مذاہب کے پیروکار، تکثیری معاشروں میں زندگی گزار رہے ہیں، باہمی مفاہمت اور رواداری کی ضرورت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ دوسرے مذاہب کے بارے میں صحیح اور قابل اعتماد معلومات حاصل کی جائیں۔ اس کے بغیر نہ تو پرامن بقائے باہم کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے اور نہ ہی کسی بھی نوعیت کے مکالمہ کے لیے کوئی گنجائش۔''[۱۸]

یعنی معاشرے میں امن وامان کے قیام اور ظلم وجور کے خاتمہ کے لیے لازمی ہے کہ تقابل ادیان اور مطالعہ ادیان کی روایت کو فروغ دیا جائے۔ اسی طرح آگے لکھتے ہیں:

> ''مطالعہ مذاہب کے باب میں مسلمانوں کی اس نہایت قدیم اور تابناک روایت سے آج بالعموم خود مسلمان بھی زیادہ واقف نہیں ہیں۔ غیر مسلم علمی حلقوں میں یہ بات عام ہے کہ مسلمان دوسرے

مذاہب کے مطالعہ میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ چنانچہ اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ اس موضوع پر مسلمان علماء نے جو عظیم الشان لٹریچر یادگار چھوڑا ہے اس سے واقفیت کے وسائل فراہم کیے جائیں۔ ہم پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے بڑی عرق ریزی اور دقت نظر سے اس خلا کو پر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ دوسرے مذاہب کے مطالعہ کے موضوع پر مسلمان نے جو غیر معمولی نوعیت کا کام کیا ہے وہ پوری طرح سامنے آجائے گا بلکہ مسلمانوں کے درمیان اس میدان میں مزید کام کرنے کی ضرورت کا احساس پیدا ہوگا۔ شائقین کی خدمت میں ہم اس کتاب کو پیش کرتے ہوئے بڑی خوشی محسوس کرتے ہیں۔''[19]

پروفیسر اشتیاق ظلی کے اس اقتباس سے کتاب کی عظمت واہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اب کتاب کے بعض ضروری مباحث پر گفتگو کی جائے گی۔

قرآن وسنت میں مطالعۂ ادیان کا ثبوت

پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی تحریر کرتے ہیں:

''اس دنیا میں عقیدہ وتہذیب کی رنگارنگی، پائی جاتی ہے، فکر وخیال، کا تنوع بکثرت پایا جاتا ہے۔ یہاں عقیدہ وعمل اور فکر ونظر کا اختلاف ہمیشہ سے ہے۔ اور ہمیشہ رہے گا۔ اسے کسی طاقت کے ذریعے ختم نہیں کیا جاسکتا ہے۔ دنیا کے زندہ مذاہب میں اسلام آخری مذہب ہے جو تہذیب وعقیدہ کے اس اختلاف کو نہ صرف تسلیم کرتا ہے بلکہ منشائے الٰہی سمجھتا ہے۔''[20]

اپنے اس مثبت اور تعمیری نظریہ کی تائید میں مصنف نے قرآن حکیم کی درج ذیل آیات سے استدلال کیا ہے''۔ سورہ ہود آیت ۱۱۸ سورہ انعام آیت ۱۰۸، سوری یونس آیت ۹۹، سورہ النحل آیت

۱۲۵، سورہ آل عمران آیت ۶۴، سورہ العنکبوت، آیت ۴۶، سورہ بقرہ آیت ۲۵۸۔

مذکورہ تمام آیات اس بات پر شاہد ہیں کہ دوسرے مذاہب کا نہ صرف احترام و تقدس کیا جائے بلکہ ان کے عقیدہ و مذہب اور رسم و رواج کے مطابق زندگی گزارنے کا حق دیا جائے۔ اسلام نے جو تہذیب امت مسلمہ کو سکھائی ہے اور جن ہدایات و خطوط پر رہنمائی کی ہے ان میں دیگر ادیان کی عظمت اور ان کے وجود و بقا کو تسلیم کرنا دین اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے۔ اسی طرح سیرت رسول اور سنت رسول سے مطالعۂ ادیان کے ٹھوس شواہد ملتے ہیں۔

صاحب کتاب نے مطالعۂ ادیان کے ثبوت میں قرآن کریم کی متعدد آیات سے استدلال کیا ہے۔ یہ بات بالائی سطروں میں آ چکی ہے کہ تقابل ادیان یا مطالعۂ ادیان کے ثبوت و شواہد عہد رسالت میں بھی جا بجا مل تے ہیں۔ چنانچہ فاضل مصنف کتاب کے پیش لفظ میں رقم طراز ہیں:

> ''محمد صلی وسلم نے جب مکے کے مشرکوں کو توحید کی دعوت دی اور بت پرستی ترک کرنے کی تلقین کی تو مشرکوں نے محمد صلی وسلم کی دعوت کی مخالفت کی، ان کو اور ان کے ساتھیوں کو ستایا، مارا پیٹا، قید کیا اور ہر طرح کی اذیت پہنچائی۔ تب محمد صل اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو افریقہ کے ملک حبشہ ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ وہاں انصاف پسند بادشاہ نجاشی حکومت کرتا تھا۔ بادشاہ اور وہاں کے باشندے عیسائی مذہب کے ماننے والے تھے اس لیے ہجرت کرنے سے پہلے قرآن پاک میں حضرت عیسی علیہ السلام کی والدہ کے نام سے پوری ایک سورہ مریم نازل ہوئی۔ اس میں حضرت عیسی اور ان کی والدہ اور ان کے پیغام کا حقیقی تعارف کرایا گیا تھا۔ تاکہ مسلمانوں کو اس مذہب کی حقیقی تعلیمات سے واقفیت ہو جائے، جس کے ماننے والوں کے درمیان ان کو جا کر رہنا ہے۔ اسی طرح محمد صلی وسلم نے مسلمانوں کے ساتھ مدینہ ہجرت کی تو وہاں یہودیوں کے متعلق قبیلے آباد تھے جیسے بنو قریظہ، بنو نضیر بنو قینقاع وغیرہ یہ یہودی قبیلہ توریت کے ماننے والے اور حضرت موسی کا اتباع کرنے

والے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مذہب کا لحاظ کرتے ہوئے ان سے معاہدہ کیا۔ ان کو انصاف فراہم کیا اور پرامن بقائے باہمی کی شروعات کی تاریخ میں یہ معاہدہ میثاق مدینہ کے نام سے مشہور ہے۔''[۲۱]

اس اقتباس کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ عہد رسالت میں مکالمہ اور تقابل ادیان کی درخشاں روایات ملتی ہیں، جو اس بات پر شاہد ہیں کہ معاشرے کو پرامن بنانے کے لیے دیگر مذاہب وادیان کا مطالعہ کیا جائے تاکہ معاشرے میں بقائے باہم کی خوشگوار راہ ہموار ہو سکے۔ اس کے علاوہ بھی مصنف نے کئی اہم ایسے مکالموں کا تذکرہ کیا ہے جن میں بذات خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے شرکت کی ہے۔

تکثیری سماج میں مطالعہ ادیان کی ضرورت

''ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد صحابہ کرام اور تابعین کے عہد میں شروع ہوئی. جنوبی ہندوستان کے ساحلی علاقوں پر ان کی بستیاں آباد ہوئیں۔ یہ لوگ سادہ مزاج تاجر تھے اور دعوتی جذبہ رکھتے تھے۔ شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی وسط ایشیا بالخصوص ترکی وایران سے آنے والے لوگوں کے علاوہ علماء اور مشائخ بھی آئے۔ یہاں انھوں نے اپنی حکومت بھی قائم کی اور اپنے مذہب و ثقافت کی اشاعت بھی کی۔ ہندوستان میں جو مذاہب پہلے سے موجود تھے ان میں بودھ مت اور ہندو مت خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مگر یہ دونوں مذاہب نسلی مذاہب تھے، دعوتی نہیں تھے۔ بالخصوص ہندو مذہب کے لوگ دوسرے مذاہب سے مکالمے ومباحثے سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے۔ ان کا مذہب برہمنوں میں محصور تھا۔ مذہب کے عقائد و رسوم پر ان کی اجارہ داری تھی۔ ہندوستانی سماج کے دیگر طبقات کو مذہبی اصول واحکام سے واقف کرانے کے یہ لوگ روادار نہ تھے۔ دوسری قوموں کو اپنی طرف بلانا ان سے مکالمہ کرنا ان کے نزدیک درست نہ تھا۔ مزید یہ کہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کو وہ ناپاک تصور کرتے تھے اور ان سے دور رہنے میں اپنی عافیت سمجھتے تھے۔''[۲۲]

اس لیے ابتدائی مسلم حکمرانوں کے دور میں ہندوستان میں خاص طور پر عہد سلطنت میں بین المذاہب مکالمہ کی مثالیں کم ملتی ہیں:

اس کے بعد ہندوستان جیسے تکثیری سماج میں تقابل ادیان کی کافی مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں۔ حتی کہ مغل حکمراں باضابطہ مکالموں کی محفلوں کو آراستہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی سرپرستی بھی فرماتے تھے۔ جہانگیر، اکبر وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔ اس سے یہ اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے کہ آج ایک طبقہ مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری اور وسیع المشربی پر سوال کھڑا کرتا ہے۔ جو یقیناً تعصب و جانبداری پر مبنی ہے، اور تاریخی حقائق کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ ہندوستان کی سماجی ہم آہنگی میں مغل حکمرانوں کی جو بے لوث خدمات ہیں ان سے ملک میں کثرت میں وحدت کا تصور مضبوط ہوا ہے۔

ہندومت میں تصور خدا

یہ سچ ہے کہ دنیا کے ہر مذہب ونظریہ میں خدا کا تصور پایا جاتا ہے۔ اسی طرح ہندوازم میں بھی خدا کے حوالے سے ایک جامع تصور پایا جاتا ہے جو ان کے متون مقدسہ میں بھی درج ہے۔ فاضل مصنف نے البیرونی کی کتاب 'تحقیق ماللہند' کے حوالے سے لکھا ہے:

> ''اللہ پاک کی شان میں ہندوؤں کا اعتقاد یہ کہ خدا ازلی ہے۔ جس کی نہ ابتدا ہے اور نہ انتہاء، اپنے فعل میں مختار ہے، قادر ہے، حکیم ہے، زندہ ہے، زندہ کرنے والا ہے، صاحب تدبیر ہے، باقی رکھنے والا ہے، اپنی بادشاہت میں اکیلا ہے، جس کا کوئی مقابل اور مماثل نہیں ہے۔ نہ وہ کسی چیز سے مشابہ ہے اور نہ کوئی چیز اس سے مشابہت رکھتی ہے۔''[۲۳]

اس اقتباس کو بیان کرنے کے بعد فاضل مصنف لکھتے ہیں:

> ''البیرونی نے اپنے اس بیان کے ثبوت میں ایک طویل مکالمہ سنسکرت زبان کی کتاب پتنجلی سے نقل کیا ہے اور دوسرا اقتباس گیتا سے نقل کیا ہے۔ تیسرا اقتباس سانک نامی کتاب سے پیش کیا ہے۔ خواص کے عقائد کے برخلاف ہندو عوام کے اعتقادات، توھمات، اصنام پرستی اور مظاہر پرستی پر مبنی ہیں۔''[۲۴]

گویا ہندو مذہب کے متون مقدسہ میں توحید کی تعلیمات ملتی ہیں۔۔ ہندوازم اور اسلام میں

توحید کے سلسلے میں مطابقت پائی جاتی ہے۔ البتہ توحید کا جو تصور ہندوازم میں پایا جاتا اب اس کی صورت مخدوش کردی گئی ہے اور تینتیس کروڑ دیوتاؤں کی پرستش کی جاتی ہے، جو افسوسناک ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندو دھرم میں بت پرستی کہاں سے آئی؟ اس سلسلے میں پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی نے لکھا ہے:

> ''برہما کا ایک بیٹا تھا جس کا نام ناردتھا۔ اس کی ایک ہی خواہش تھی کہ وہ اپنے رب کو دیکھے۔ وہ راہ چلنے کے لیے ہمیشہ ایک لاٹھی اپنے پاس رکھتا تھا۔ جب وہ اس لاٹھی کو زمین پر پٹکتا تھا تو وہ سانپ بن جاتی تھی۔ وہ اس سے عجیب وغریب کام لیتا اور کبھی اسے جدا نہیں کرتا تھا۔ ایک دن وہ رب کے دھیان میں تھا کہ دور اسے روشنی دکھائی دی۔ وہ روشنی کی طرف گیا۔ روشنی سے آواز آئی کہ تو جو چیز مانگتا ہے اور جس چیز کی تمنا رکھتا ہے وہ محال ہے، تیرے لیے ممکن نہیں کہ تو اس طریقہ کے سوا اور طریقہ سے دیکھے۔ نارد نے نظر اٹھائی تو انسان کی شکل وصورت کا ایک نورانی شخص کھڑا تھا۔ اس وقت سے صورتوں کے بت بنائے جانے لگے۔''[۲۵]

اس طرح ہندو دھرم میں مظاہر پرستی اور بت پرستی کا آغاز ہوا۔

چنانچہ اب اس دھرم کی حقیقی صورت وتعلیمات، توھمات وخیالات اور نت نئے افکار و نظریات میں گرد آلود ہوچکی ہیں۔ بلکہ اس سے بھی ظلم بالائے ظلم یہ کہ ایک مخصوص طبقہ اب ہندو دھرم کو اپنی جاگیر سمجھ بیٹھا ہے۔ اس لیے ہندو عوام کو سوچنا ہوگا اور یہ طے کرنا ہوگا کہ مذہب کے نام پر جو طبقہ عوام کا استحصال کررہا ہے وہ سراسر غلط ہے۔ اس لیے پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی کی کتاب 'مطالعہ مذاہب کی اسلامی روایت' کی موجودہ زمانہ میں افادیت واہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ادیان و مذاہب کے جہاں بہت سارے جدید گوشوں کا انکشاف ہوگا، وہیں ہندوستان کے تکثیری معاشرہ میں امن وامان اور رواداری کی پرکیف فضا بھی ہموار ہوگی۔ تکثیری سماج کی اصل روح بھی تحمل و برداشت اور سماجی ہم آہنگی ہے، جب تک سماج میں نوع انسانیت صلح وآشتی اور حلم و

بردباری کے زیور سے آراستہ نہیں ہوتی ہے اس وقت تک کوئی بھی تکثیری یا مخلوط سماج فلاح وسعادت کی منازل طے نہیں کرسکتا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کتاب سے اس بات کا بھی ازالہ ہو جائے گا کہ جامعات میں تقابل ادیان پر کام کرنے والے محققین کے پاس اردو زبان میں، ابھی تک کوئی بھی اس نوعیت کا سرمایہ نہیں تھا۔ اس لیے یہ کتاب محققین کے لیے نعمت غیر مترقبہ کے مترادف ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی اس کتاب سے صاف ہوگئی کہ جو لوگ ابھی تک مسلم کمیونٹی پر یہ الزام عائد کرتے تھے کہ مسلم مفکرین نے دیگر مذاہب کی بابت کوئی خاص اور وقیع کام نہیں کیا ہے، اس کتاب کی اشاعت وترویج نے اس اعتراض کو بھی یکسر معدوم کر دیا۔ لہٰذا اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس طرح کے لٹریچر کو پڑھ کر اور ترویج اشاعت کر کے معاشرہ میں سکون وچین اور عدل وانصاف کے قیام کے تئیں سعی کی جانی چاہیے۔ تاکہ تکثیری سماج کی روحانیت باقی رہے اور ایسے معاشروں میں سکونت پذیر عوام مسرت وشادمانی اور امن ویکجہتی کے ساتھ گزر بسر کر سکے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ نوجوان نسل دیگر مذاہب وادیان سے وابستگی پیدا کرے کیونکہ ہم اپنے معاشرے میں دیکھتے ہیں کہ نوجوانوں کا ایک بڑا طبقہ لاعلمی اور عدم واقفیت کی بناء پر دیگر مذاہب کے تعلق سے بہت ساری غلط فہمی پالے ہوئے ہے۔ یہ غلط فہمیاں اسی وقت دور ہوسکتی ہیں، جب نوجوان نسل دیگر مذاہب کو جاننے کی کامیاب سعی کرے۔ چنانچہ اس کتاب کا تابناک پہلو بھی اس بات کی تحریک دیتا ہے کہ نئی نسل اگر معاشرے میں پرامن وپرسکون ماحول کی خواستگار ہے تو یقیناً انہیں دیگر مذاہب و ادیان کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ، تحقیق وتفتیش کا بھی عمل، توسع اور تعصب وتنگ نظری کی عینک ہٹا کر انجام دینا ہوگا۔ اسی کے ساتھ اس بات کا بھی نوجوان نسل پاس ولحاظ رکھے کہ کسی بھی دین یا مذہب کو تنقید وتنقیص کا نشانہ بنانے سے قبل مناسب ہے کہ اس کے بارے میں مستند ومعتبر مآخذ کے ذریعے اپنی معلومات کو درست کرلیا جائے۔ جب نوجوان نسل کا تحقیقی مزاج بن جائے گا تو یقیناً کسی بھی تکثیری سماج کا امن وسکون غارت نہیں ہوگا۔ نیز محبت وانسیت، تحمل وبرداشت اور بقائے باہم کی بوسیدہ ہوتی تہذیب کو نئے سرے سے تازگی وجلا حاصل ہوگی۔ آج کے معاشرے کی بنیادی ضرورت بھی یہی ہے کہ اپنے اپنے اعتقاد ودین پر عمل کرتے ہوئے معاشرے میں سماجی ہم آہنگی کی پرکیف فضا کے فروغ کے تئیں کاوش کی جائے۔

قرآن اور گیتا کا تصور فلاح

پروفیسر توقیر عالم فلاحی ہندوستان کے معتبر عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ عصری علوم و معارف سے بھی پوری طرح آشنا ہیں۔ ان کی علمی ،ادبی اور تحقیقی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ تقریباً تین درجن کتابوں کے مصنف اور سیکڑوں مقالات کے مؤلف ہیں۔ اسی طرح وہ ملک وملت کی نمائندگی ملک اور بیرون ملک میں منعقد ہونے والی کانفرنسوں میں متواتر شرکت فرما کر کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی تحقیقی سرگرمیوں کا میدان جہاں قرآنیات، علم حدیث کو بنایا ہے تو وہیں ان کی تحریروں میں سماجیات، معاشیات ، اخلاقیات اور یکجہتی و معاشرتی ہم آہنگی کے بھی عناصر بخوبی ملتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کا امتیاز یہ بھی ہے کہ انھوں نے ہندوستانی ادیان کا مطالعہ بھی بنظر غائر کیا ہے اور اس حوالہ سے مقالات ومضامین صفحۂ قرطاس پر ثبت کرنے کے ساتھ ساتھ کتابیں بھی تحریر کی ہیں۔ انھوں نے اب تک تقابل ادیان یا مطالعۂ ادیان پر دو کتابیں تصنیف کی ہیں۔

قرآن اور گیتا کا تصور فلاح

عظیم ہندوستانی مذاہب

ذیل کی سطور میں راقم پروفیسر توقیر عالم فلاحی کی تقابل ادیان پر لکھی گئی کتابوں کا تعارف پیش کررہا ہے۔

مطالعۂ ادیان کی افادیت

ہندوستانی ادیان کے مطالعہ اور اس پر بحث وتحقیق کی اس وقت جو ضرورت ہے اس سے کسی طرح انحراف نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مطالعۂ ادیان سے جہاں مذاہب کے خلاف معاشرے میں پھیلی بدعنوانیاں دور ہوتی ہیں تو وہیں اس سے تحقیق وتفتیش کے جدید گوشے بھی وا ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ معاشرتی اور سماجی رشتوں کو جو تقویت اور استحکام مطالعۂ ادیان سے ملتا ہے وہ بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ چنانچہ پروفیسر توقیر عالم فلاحی نے اپنی کتاب ''عظیم ہندوستانی مذاہب'' کے مقدمہ میں مطالعۂ ادیان کی ضرورت واہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے تین وجوہات رقم کی ہیں:

۱- مطالعۂ مذاہب دینی اور مذہبی ضرورت
۲- سماجی ومعاشرتی پہلو
۳- علمی وتحقیقی ضرورت

لہٰذا ذیل میں ان کو پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

''مطالعہ مذاہب دینی اور مذہبی ضرورت ہے۔ ایک آدمی کا خواہ کسی بھی مذہب سے تعلق ہو، بلاشبہ یہ اس کی زندگی میں سب سے زیادہ قیمتی نعمت ہے۔ اس نعمت عظمیٰ کی بنا پر دنیا کی یہ چند روزہ زندگی صالحیت و انسانیت کی ترجمان بنتی ہے اور دوسری طرف یہ لافانی زندگی مسرتوں کے حصول کا توشہ راہ ثابت ہوتی ہے۔ گویا دین ومذہب اس زوال آشنا اور تغیر پذیر زندگی کو بھی شرافت وانسانیت کے جوہر سے مرصع کرتا ہے اور موت کے بعد کی زندگی میں بھی سعادت وکامرانی کی ضمانت بنتا ہے۔ اس لیے مفروضات وتحفظات (Supposition and Reservation)) روا رکھنے اور تردد وپس وپیش کی کیفیت سے دوچار ہوئے بغیر عارضی اور مستقل فلاح و بہتری کے لیے ادیان ومذاہب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

مذاہب کے مطالعہ کی اہمیت کا دوسرا پہلو سماجی ومعاشرتی ہے۔ انسان سماجی حیوان ہے۔ ایک دوسرے کے بغیر زندگی گزاری نہیں جاسکتی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ایک دوسرے کے مذہب، ثقافت اور طریقہ زندگی کو جانے بغیر سماجی زندگی بے کیف وبے سرور ہوجاتی ہے اور میل جول نیز موانست ومحبت کے جذبات فروغ پانے کے بجائے انتشار وافتراق اور نفرت وعداوت کی بھٹیاں سلگنے لگتی ہیں۔ اس لیے یہ ناگزیر ہوجاتا ہے کہ مذاہب، ان کے مستند مصادر ومراجع، بزرگ وبلند قامت ہستیاں اور متبرک ومقدس مقامات کی واقفیت ہو، تاکہ ایک دوسرے

کے مذہب اور مذہبی جذبات احساسات کا خیال کیا جائے اور اس طرح معاشرتی زندگی کے حسن و زیبائی کے لیے راہیں ہموار ہو جائیں۔
مطالعہ مذاہب کی ضرورت و اہمیت کا ایک پہلو علمی اور تحقیقی ہے۔ علم و تحقیق کا تقاضا یہ ہے کہ زندگی کی مہتم بالشان ضرورت مذہب کو نہ صرف یہ کہ نظر انداز نہ کیا جائے بلکہ اپنے مذہب کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب کے علوم و معارف سے بھی شناسائی ہو اور معروضی انداز میں مخاطب معاشرہ کے سامنے حقائق تشت از بام کیے جائیں تا کہ صحت منداذہان وقلوب ان سے مجلی و مصفی ہو سکیں۔''[۳۶]

متذکرہ اقتباس کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ مطالعۂ ادیان یا تقابل ادیان کو تحقیق و تفتیش کا میدان بنانے کی علمی، سماجی اور دینی ضرورت ہے۔ البتہ جہاں اس کے سماجی اور تہذیبی فوائد ہیں تو وہیں یہ بھی سچ ہے کہ ہمارے یہاں مطالعۂ ادیان خصوصا غیر سامی ادیان پر یعنی ہندومت، بدھ مت، سکھ مت اور جین مت پر بڑے پیمانے پر کام نہیں ہوا ہے۔ اس سست روی کو توڑنے کی سخت ترین ضرورت۔ اس اصولی اور تمہیدی گفتگو کے بعد اب مذکورہ دونوں کتابوں کا یکے بعد دیگرے تعارف کرایا جائے گا۔

قرآن اور گیتا کا تصور فلاح

پروفیسر تو قیر عالم فلاحی کی یہ ایک اہم اور جامع کتاب ہے جو انسانیت کی فلاح و بہبود اور اس کی دنیوی و اخروی سعادت و کامرانی پر ناطق ثبوت ہے۔ یہ کتاب ۲۰۱۴ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس کی ضخامت ۱۰۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ نیز ایک مقدمہ اور چار ابواب پر مشتمل ہے۔ کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس کے محتویات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

باب اول۔ عظمت قرآن کریم اور انسان

۱- فلاح و کامرانی کے اہم محرکات

۲- ہندومت اور بھگوت گیتا

۳- گیتا میں نجات کے اہم عوامل

کتاب کے ابواب سے جہاں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب تقابل ادیان پر علمی اور تحقیقی ہے تو وہیں مصنف کی متنوع فکر، متوازن و معتدل نظریہ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یاد رکھیے وہ مصنف اور مفکر زندہ رہتے ہیں جو کسی بھی تہذیب، دھرم اور کلچر کے ساتھ رتی بھر بھی تعصب و جانبداری کا رویہ اختیار نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ بلاتعصب علم و تحقیق کی بنیاد پر جو مواد ملتا ہے اس کو پوری امانت و دیانت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اس حوالے سے پروفیسر تو قیر عالم فلاحی کی یہ خدمت بھی بڑی قابل قدر اور قابل فہم ہے۔ کیونکہ ان کی تحریروں میں متوازی فکر، معتدل اور تحقیقی مزاج ملتا ہے جو انہیں صف اول کے مصنفین میں کھڑا کر دیتا ہے۔

حواشی

۱۔ سید حامد علی، (مولانا)، ہندومت اور توحید، شہادت حق، بارہ دری، بلیماران، دہلی، ۱۹۶۶ء، ص ۵

۲۔ سید حامد علی، (مولانا)، ہندومت اور توحید، ص ۷

۳۔ سید حامد علی، (مولانا)، ہندومت اور توحید، ص ۷

۴۔ ایضاً، ص ۱۶

۵۔ سید حامد علی، (مولانا)، ہندومت اور توحید، ص: ۱۷-۲۰

۶۔ سید حامد علی، (مولانا)، ہندومت اور توحید، ص: ۲۰

۷۔ سید حامد علی، (مولانا)، ہندومت اور توحید، ص: ۶۲

۸۔ سید حامد علی، (مولانا)، ہندومت اور توحید، ص: ۶۴

۹۔ ایضاً، ص: ۸۷-۸۸

۱۰۔ سید حامد علی، (مولانا)، ہندومت اور توحید، ص ۹۱

۱۱۔ ایضاً، ص: ۹۳

۱۲۔ وید کا تعارف صفحہ، ۵-۶

۱۳۔ وید کا تعارف صفحہ، ۱۲-۱۳

۱۴۔ وید کا تعارف، صفحہ، ۱۲-۱۲

۱۵۔ ایضاً، ص: ۱۴

۱۶۔ قاسمی، محمد سعود عالم (پروفیسر)، مطالعۂ مذاہب کی اسلامی روایت، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۹ء، ص:۱۷
۱۷۔ قاسمی، محمد سعود عالم (پروفیسر)، مطالعۂ مذاہب کی اسلامی روایت، ص:۸
۱۸۔ ایضاً، ص:۸
۱۹۔ قاسمی، محمد سعود عالم (پروفیسر)، مطالعۂ مذاہب کی اسلامی روایت، ص:۱۹
۲۰۔ قاسمی، محمد سعود عالم (پروفیسر)، مطالعۂ مذاہب کی اسلامی روایت، ص:۱۱
۲۱۔ قاسمی، محمد سعود عالم (پروفیسر)، مطالعۂ مذاہب کی اسلامی روایت، ص:۵۳
۲۲۔ قاسمی، محمد سعود عالم (پروفیسر)، مطالعۂ مذاہب کی اسلامی روایت، ص:۱۰۲
۲۳۔ ایضاً، ص:۱۰۲
۲۴۔ قاسمی، محمد سعود عالم (پروفیسر)، مطالعۂ مذاہب کی اسلامی روایت، ص:۱۰۲
۲۵۔ نائک، عبدالکریم ذاکر، (ڈاکٹر)، اسلام اور ہندومت (ایک تقابلی مطالعہ)، ص:۱۰
۲۶۔ ایضاً، ص:۱۰-۱۱
۲۷۔ نائک، عبدالکریم ذاکر، (ڈاکٹر)، اسلام اور ہندومت (ایک تقابلی مطالعہ)، ص:۱۱
۲۸۔ ایضاً، ص:۱۲
۲۹۔ نائک، عبدالکریم ذاکر، (ڈاکٹر)، اسلام اور ہندومت (ایک تقابلی مطالعہ)، ص:۲۰
۳۰۔ ایضاً
۳۱۔ نائک، عبدالکریم ذاکر، (ڈاکٹر)، اسلام اور ہندومت (ایک تقابلی مطالعہ)، ص:۳۹
۳۲۔ نائک، عبدالکریم ذاکر، (ڈاکٹر)، اسلام اور ہندومت (ایک تقابلی مطالعہ)، ص:۴۲-۴۳
۳۳۔ ایضاً، ص:۴۶
۳۴۔ ایضاً، ص:۴۷
۳۵۔ فلاحی، توقیر عالم، (پروفیسر) عظیم ہندوستانی مذاہب، ناشر مصنف، ۲۰۱۵ء، ص۱۴-۱۵
۳۶۔ فلاحی، توقیر عالم، (پروفیسر) قرآن اور گیتا کا تصور فلاح، ص۶۵

(جاری)

(سہ ماہی)

اسلام اور عصرِ جدید

کے خاص شمارے

سیرت ومغازی کی اولین کتابیں اور ان کے مؤلفین............۲۰۰روپے
اسلامی تھذیب وتمدن (دورِ جاہلیت سے آغاز اسلام تک)............۳۰۰روپے
نذرِ علی محمد خسرو..۱۰۰روپے
بیاد خواجہ غلام السیّدین..۱۰۰روپے
بیاد پروفیسر مشیر الحق..۲۰۰روپے
افکارِ ذاکر..۱۵۰روپے
مولانا عبیداللّٰہ سندھی..۲۰۰روپے
ڈاکٹر سید عابد حسین اور نئی روشنی............................۲۵۰روپے
مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت..۱۵۰روپے
نذرِ رومی..۲۰۰روپے
قرآن مجید، مستشرقین اور انگریزی تراجم............................۱۰۰روپے
پیکر دین ودانش: امام غزالیؒ..۳۰۰روپے
معلمِ عصر: سعید نورسیؒ ۲۰۰روپے

ان کے علاوہ پچھلے عام شمارے بھی ۱۰۰روپے کی شرح سے دستیاب ہیں۔ اسٹاک محدود ہے۔ پانچ شماروں پر ۱۵فیصد تجارتی کمیشن بھی دیا جائے گا۔ محصول رجسٹرڈ ڈاک خریدار کے ذمے ہوگا۔

رابطـــہ

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

Vol. LV I No. 2 I R.N.I. No. 17614/69 I April 2023

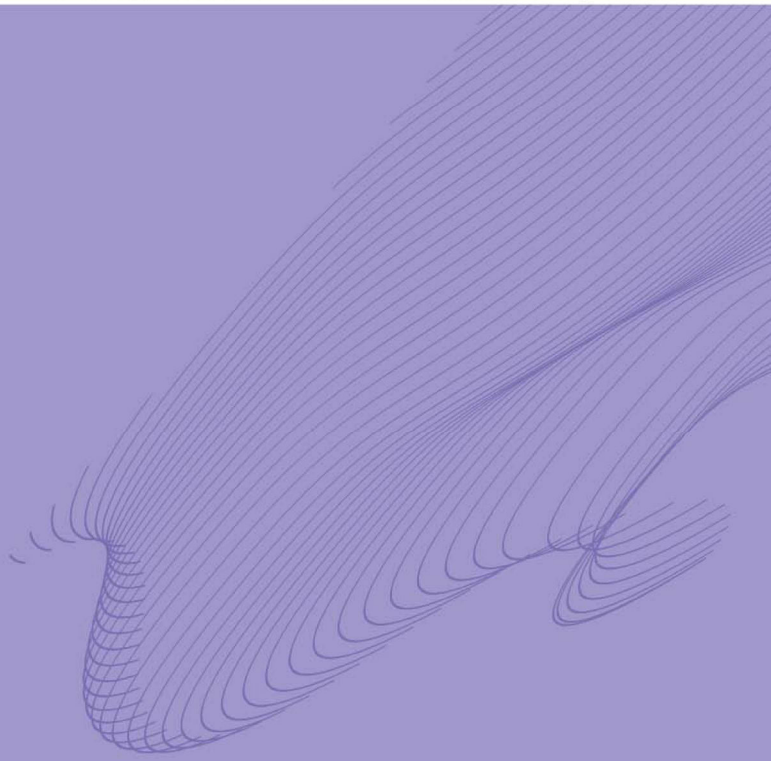

ISLAM AUR ASR-I-JADEED

ISSN 2278-2109

Zakir Husain Institute of Islamic Studies
Jamia Millia Islamia, Jamia Nagar, New Delhi-110025
Phone: 011-26841202